مختصر

القصہ

مرزا عصمت اللہ بیگ

مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

ناشر عصمت میموریل پبلیکیشنز

مرزا عصمت اللہ بیگ

کے

مختصر مضامین کا انتخاب

مرتبہ و پبلیشرز

عصمت میموریل پبلیکیشنز حیدرآباد

طباعت بہ اعانت

- ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ، حیدرآباد
- آدبی ٹرسٹ، حیدرآباد
- بزم اردو (جدہ)

اشاعتِ اوّل — جنوری ۱۹۸۸ء تعداد پانچسو (۵۰۰)

کتابت — حمید حیدرآبادی

سرورق ڈیزائن — مرزا امان اللہ بیگ

قیمت — ۲۰ روپئے (بیس روپے)

ملنے کے پتے

- نیوز ٹرسٹ آف انڈیا، مکرم جاہی روڈ، حیدرآباد ۱
- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵
- حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان، حیدرآباد ۲
- الیاس ٹریڈرس۔ شاہ علی بنڈہ حیدرآباد ۲

طباعت:۔ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارمینار، حیدرآباد

فہرست

مضامین

اداریہ۔ روزنامہ سیاست

مورخہ یکم نومبر ۱۹۷۵ء

یومِ عصمت

مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے پرسوں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ عصمت اللہ بیگ اگر حیدرآباد کے بجائے کسی اور شہر میں پیدا ہوتے تو یقیناً انہیں صفِ اول کا طنز و مزاح نگار قرار دیا جاتا لیکن وہ حیدرآبادی شہری ہو گئے تھے اور حیدرآباد کے جوہرِ قابل بھی ہمیشہ پس منظر میں رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ عصمت اللہ بیگ کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔ عصمت اللہ بیگ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلاشبہ اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ آج پورے ہندستان میں رشید احمد صدیقی کنھیالال کپور اور عصمت اللہ بیگ یہی تین ادیب ایسے ہیں جو صفِ اول میں ہیں۔ اب عصمت اللہ بیگ باقی نہیں رہے۔

عصمت اللہ بیگ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے میں وزیر تعلیمات شری ایکبوٹے اور نائب وزیر مال شری ہنمنت راؤ نے بھی حصہ لیا۔ ہم ان دونوں وزراء کی اس جلسہ میں شرکت کو اہمیت دیتے ہیں۔ چونکہ اردو کے ایک ممتاز ادیب کی خدمات کے اعتراف میں وہ بھی عوام کے ہمنوا رہے اور اس شاعر و ادیب کے غیر مطبوعہ تصانیف کو شائع کرانے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں یہ شرکت حیدرآباد کی روایات کے عین مطابق بھی تھی۔ اس جلسہ کے ساتھ یہ خیال آتا ہے کہ آئندہ ڈھانچے میں ایسی رواداری کے مظاہر کیا دیکھنے میں آئیں گے؟

آزادی کے فوری بعد ہمارے شہر میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی قائم کردہ اردو مجلس اردو والوں کا ایک منظم پلیٹ فارم تھی جس میں پدما بھوشن ڈاکٹر غلام یزدانی پروفیسر ہارون خان شروانی ڈاکٹر سجاد مرزا سعید جنگ، فضل الرحمن اور حبیب الرحمن کے علاوہ ممتاز ادیب و شاعر اور مشاہیر شرکت کیا کرتے تھے ۔ مضامین پڑھے جاتے اور علمی بحث ہوتی تھی۔ یہی اردو مجلس پولیس ایکشن کے بعد اردو تحریک اور سرگرمیوں کے لئے انجمن ترقی اردو کے استحکام کا باعث بنی ۔ اس مجلس کے قابلِ ذکر شرکاء میں مرزا عصمت اللہ بیگ بھی تھے ۔ جن کے مضامین اور جن کی شاعری اردو مجلس میں تبسم ذہنی کے ساتھ ساتھ اُردو والوں میں ایک نیا اعتماد پیدا کرتی تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد دفاتر اور عثمانیہ یونیورسٹی سے اُردو کے اخراج کے دَور میں اردو مجلس اور انجمن ترقی اردو عوام میں جو نیا حوصلہ پیدا کر رہے تھے اس وقت کے لکھنے والوں میں عصمت اللہ بیگ کے مضامین جہاں ہماری

تہذیب کے مختلف اقدار کے ترجمان و مظہر تھے: میاں وہ اپنے انداز نگارش سے قہقہہ اور تبسم بکھیرتے ہوئے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے تسلسل اور کڑی کو مستحکم بنا رہے تھے جس کی داغ بیل حیدرآباد میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے رکھی تھی۔

مرزا صاحب یوں تو پولیس ایکشن سے پہلے بھی دکن ریڈیو سے اپنے مضامین اور کلام کے باعث ادیبوں اور شاعروں میں اپنا ایک مقام بنا چکے تھے۔ مگر اب وہ ادیب و شاعر کے علاوہ اردو کے ایک خدمت گذار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ سجاد مرزا صاحب نے اپنے دور ملازمت میں جہاں "اردو کا قاعدہ" اور اردو نستعلیق ٹائپ کی ایجاد سے اپنا نام تاریخ میں بنا رکھا ہے انہوں نے برطانوی شہرہ آفاق ادیب ای۔ ایم فاسٹر سے جو ان کے لندن کے ساتھیوں میں تھے اردو ہال کے لئے گراں قدر عطیہ حاصل کیا تھا۔ عصمت اللہ بیگ کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ سجاد مرزا صاحب کے قریبی رفیق تھے اردو کے کام میں بھی عصمت اللہ بیگ کا حصہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"القصہ مختصر" ان کے چند مضامین کا مجموعہ ہے "بازاری دوا فروش" "گریٹ پامسٹ" "بھانڈوں کی کہانی بھانڈوں کی زبانی" اور "ہماری مکھیاں" یہ صرف مزاحیہ و طنزیہ مضامین ہی نہیں ہیں بلکہ اس دور کے حالات واقعات اور افراد و کردار کے آئینے ہیں۔ سڑکوں پر دوا فروش اب بھی ہیں مگر عصمت اللہ بیگ نے جس دوا فروش کو پیش کیا ہے وہ صاحب زبان اور عجب نباض تھا۔ ایسے کئی کردار اب ختم ہو رہے ہیں۔ "القصہ مختصر" میں بعض ایسے کردار ان العہد

واقعات کی پیش کش، عکاسی اور منظر نگاری بھی ہے۔ جسے دکھنی تہذیب کی حفاظت قرار دیا جا سکتا ہے۔

اکثر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ حیدرآباد کی پرانی تہذیب اور کرداروں کے بارے میں جتنا مواد مل سکے اسے محفوظ کیا جائے۔ عصمت اللہ بیگ کے "القصہ مختصر" میں گذشتہ زرین حیدرآباد محفوظ ہے طنز و مزاح کے روپ میں عصمت اللہ بیگ کا نام روشن و بلند رہے گا۔ ان کے بعد زندہ دلان حیدرآباد نے شمع اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔

عصمت اللہ بیگ کے مزاحیہ شعر عہد حاضر کے مزاحیہ شاعر کے معیار کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مزاح نگار عصمت اللہ بیگ صاحب کی مرنجان مرنج شخصیت بھی نوجوانوں اور ان کے معاصرین دونوں میں مقبول تھی وہ نوجوانوں کے دوست اور ساتھی بھی تھے۔ ان کے مضامین کے مجموعہ کی اشاعت ہمارے ایک ادبی ورثہ کی حفاظت ہے اور اس کی اشاعت سے ان کی یاد اور ان کی خدمات کو ہمارا خراج بھی ہے۔ اگر ان کا مجموعہ کلام بھی جو اب ناپید ہے شائع ہو رہا ہے تو یہ ہمارے معیاری ادب کی حفاظت کے علاوہ نئی نسل کے لئے رہنما بھی ہو گا۔

عابد علی خان

حیدرآباد
[illegible] جولائی ۱۹۸۷ء

عصمت اللہ بیگ کا طرزِ نگارش

عصمت اللہ بیگ یوں تو نثر میں بہت سے کارنامے چھوڑے ہیں لیکن اُن کے اہم کارناموں میں سے ایک "حکایاتِ رُومی" ہے اور دوسرا "حکایاتِ سعدی و جامی" ہے۔ یہ دونوں تصانیف یادگاری حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ کتابیں فارسی میں مولانا رُومی اور حضرت سعدی کی مخصوص طرزِ نگارش کی وجہ سے ادبی اہمیت کی مالک سمجھی جاتی ہیں۔ اِن کتابوں کا ترجمہ آسان کام نہ تھا۔ چہ جائیکہ اس میں ادبیت اور ظرافت پیدا کی جاتی۔ یہاں عصمت اللہ بیگ کی صحیح قدر و قیمت ہم کو معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے ترجمہ کو اصل کی طرح دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ادب کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود بعض مشہور ادیبوں نے اسی طرح کی کوشش کی ہیں۔ خود اردو زبان میں علامہ حیدر علی حیدر۔ حیدر یار جنگ طباطبائی نے "گریٔے" کی (ELEGY) کا جو ترجمہ گورِ غریباں کے نام سے کیا تھا وہ ایک بلند پایہ ادبی پارہ سمجھا جاتا ہے۔ دراصل دوسری زبانوں کے شاہکاروں کا ترجمہ ایک ٹیکنک ہے۔ ترجمہ میں

اصل فقروں، ترکیبوں اور حسین اظہاروں کو لفظی طور پر منتقل کرنے کی کوششیں بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر ترجمہ کرنے والا زبان پر قدرت اور ادبی ذوق رکھتا ہے تو اپنی زبان کے حسین اظہاروں کے سانچے میں ان کارناموں کو بآسانی ڈھال لیتا ہے۔ حقیقت میں اس کارنامہ کو بازتخلیق " RE CREATION " کہا جا سکتا ہے۔ اس ٹیکنک سے ہر کامیاب مترجم جبلّی طور پر واقف ہوتا ہے۔ علامہ طباطبائی کی ٹیکنک کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولوی عنایت اللہ نے جنگل بک کے ترجمہ " زلفی " میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور اس ٹیکنک سے عصمت اللہ بیگ بھی بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اکثر کتابوں کو اردو کا نیا تخلیقی روپ دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی اکثر جدید زبانوں کی طرح اردو میں بھی نئے ادبی معیار ابھی سیال حالت میں ہے۔ اسی لئے ہمارے عام قارئین اور نقادوں کے میعاروں میں بھی وسیع یکسانیت پیدا نہ ہوسکی ہے۔ رہے کلاسیکل ادبی میعار وہ بلاشبہ اپنی جگہ برقرار ہیں۔ لیکن اس کے پرکھنے والے بہت کم ہیں۔ عصمت اللہ بیگ نے اکثر کتابوں کو اردو زبانوں کے ادبی مزاج اور ان کے حسین اظہاروں کے سانچوں میں ڈھال لیا ہے۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عصمت اللہ بیگ اردو زبان کے ادبی مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عصمت اللہ بیگ کے ادبی میعار، کلاسیکل ادبی میعار ہیں اور وہ جدید دور کے ادبی میعاروں سے تعرض نہیں کرکے بیسویں صدی میں لکھتے ہوئے، رومی، سعدی، اور جامی کے اسلوب

کی پیروی کرتے تھے۔

عصمت اللہ بیگ کی جس تصنیف میں سعدی اور جامی کی متفرق حکایتیں پیش کی گئی ہیں اور وہ کتاب دراصل سعدی اور جامی کی حکایتوں پر مشتمل ہے۔

سعدی کی حکایات ان کے عالمی شہرت رکھنے والے کارنامے "گلستان" سے لی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعدی کا مخصوص اندازِ نگارش عصمت اللہ بیگ کو بہت پسند تھا۔ چنانچہ انہوں نے "گلستان" کی منتخب حکایتوں کو سعدی ہی کے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اِس ترجمہ میں فارسی کے اسلوب کی پوری تقلید ممکن نہیں تھی۔ عصمت اللہ بیگ نے فارسی کی سادہ پُرکاری کو اردو میں جس سلیس اور بول چال کی سادگی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ نظم کے حصوں میں شعریت کی زیادہ گنجائش نہیں تھی تاہم اِس تلافی اخلاقی نکات سے ہوجاتی ہے۔ بعض جگہ منظوم ترجمہ اتنا برجستہ ہوا کہ تعریف کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔ مثلاً ایک بادشاہ اور قیدی کی حکایت کے چند جملے یہ ہیں۔

کسی بادشاہ نے ایک قیدی کے بارے میں یہہ حکم دیا کہ اُس کو مارڈالا جائے جب وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوا تو بادشاہ کو بُرا بھلا کہنے لگا اور گالیاں دینے لگا۔

مثل مشہور ہے کہ جو آدمی اپنی زندگی سے مایوس ہوجاتا ہے تو چُپ نہیں رہتا جو مُنہ میں آئے کہہ جاتا ہے۔

نہیں سوجھتی جبکہ بلّی کی چال ؎ تو چیتے کی لیتی ہے آنکھیں نکال

کہیں کہیں ترجمہ اصل کا لطف دے جاتا ہے۔ یہ وہ موقعے ہیں جہاں سعدی کی بلیغ اور مسجع عبارت کی نگہداشت بڑے اہتمام سے کی گئی ہے۔ ادبی تحریر کے اِس انداز کو جیسے عصمت اللہ بیگ نے سعدی سے لیا ہے رومی اور جامی تک وسیع کیا اور یہی نہج ان کی طبیعت کو بھایا لیکن رومی اور جامی کی حکایتوں کے اسلوب کو سعدی کے بنے بنائے چوکھٹے نہیں مل سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی اپنی ذہانت سے انہوں نے سعدی کے اسلوب کے چوکھٹے میں رومی اور جامی کے حکایات کو جس طرح بٹھایا ہے وہ عصمت اللہ بیگ کے مخصوص اسلوب کے لحاظ سے نُدرت اور موضوع کے لحاظ سے عصمت اللہ بیگ نے اندازِ نگارش میں جو دلکشی اور برجستگی پیدا کی ہے [illegible]زنت میں مینارِ نُور کی حیثیت رکھتی ہے۔

[illegible] اللہ بیگ کی اکثر کتابوں کے مخاطب ادب کے مبتدی ہیں۔ خواہ وہ بچے ہوں یا بڑے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ سعدی کی حکایتوں کی طرح اپنے اسلوبِ بیان کی دلکشی اور زبان کی سَلاست کی وجہ سے ہر پڑھنے والے کے لئے یکساں دلچسپی رکھتی ہیں۔ جن لوگوں کو عصمت اللہ بیگ کے ادبی کارنامے پڑھنے کا موقع ملا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اُن کی تحریروں میں اساتذہ قدیم کی تحریروں کا لطف موجود ہے، اُن کی تحریروں میں روتوں کو ہنسانے اور مُردہ دلوں میں رُوح پھُونکنے کا وصف پنہاں ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ اُن کی لکھی ہوئی بہت سی کتابیں ابھی مسوّدوں کی شکل میں بند اور عوام کی نظروں سے اُوجھل پڑی ہیں، اگر ہمارے ملک کے ادبی ادارے

اور علم وفن کے قدردان اس سارے کے سارے سرمایہ کو جو قومی اور ادبی ورثہ سے ہے شائع کرنے اور منظر عام پر لانے کا اہتمام کریں تو ہمارے گذرے ہوئے مزاح نگار اور ظریفانہ ادیب کی شایانِ شان یادگار ثابت ہوگی۔

پروفیسر عبدالقادر سروری
سابق صدر شعبہ اردو
جامعہ عثمانیہ

حمایت نگر
مارچ سنہ ۱۹۵۵ء

یہ امر میرے لئے باعث خوشی ہے کہ ممتاز مزاحیہ نگار مرزا عصمت اللہ بیگ کے دلچسپ مضامین کا ایک حسن انتخاب "القصہ مختصر" پر مجھے دیباچہ تحریر کرنے کا موقع ملا ہے جو ادبی ٹرسٹ، ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ اور بزم اردو (جدہ) کی سرپرستی و اشتراکِ عمل سے منظرِ عام پر آرہا ہے۔

عصمت اللہ بیگ کا اندازِ بیان بہت ہی سادہ اور اسلوب کافی خوشگوار ہے، وہ انگریزی الفاظ اسطرح استعمال کرتے ہیں کہ مضامین کا رنگ اور بھی نکھر جاتا ہے مختلف موضوعات پر انکے مضامین کافی دلچسپ اور شگفتہ رنگ لئے ہوئے ہیں۔

عصمت اللہ بیگ نے طنز و ظرافت کے نازک نشتروں سے ہمارے سماج کے بعض چھپے ہوئے ناسوروں کو اِس کمالِ فن کے ساتھ چھیڑا ہے کہ ان کے انداز اور لطیف طنز کی تعریف کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔

بہر حال مجھے قوی امید ہے کہ اہلِ ذوق "القصہ مختصر" جو اُردو ظرافت میں ایک قابلِ لحاظ اضافہ ہے کافی شوق سے پڑھیں گے۔ عصمت میموریل کمیٹی مرزا عصمت اللہ بیگ کے دیگر غیر مطبوعہ مزاحیہ ادب کے کارناموں کو عوام کے سامنے لانے کی کامیاب سعی کرے گی۔

نواب طاہر علی خان

علی کاٹیج، مکرم جاہی روڈ، حیدرآباد

عرضِ حال

مرزا عصمت اللہ بیگ کے مختصر مزاحیہ مضامین کا دلچسپ انتخاب "القصہ مختصر" کے نام سے آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ہم نواب عابد علی خان صاحب مدیر روزنامہ سیاست کا تہہ دل سے شکر گذار ہیں کہ صاحب موصوف نے اس کتاب پر "پیش لفظ" تحریر کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

نواب طاہر علی خان کا بھی شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے جنہوں نے ابتداً سے لے کر آخر تک مرزا عصمت اللہ بیگ کی غیر مطبوعہ تصانیف کی اشاعت میں سرپرستی کرتے رہے ہیں۔

ہم معزز ٹرسٹیز ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ، ادبی ٹرسٹ کی مینجنگ بورڈ کے معزز ارکان اور بزم اردو "جدّہ" کے معتمد مسٹر شریف اسلم کے شکر گذار ہیں جنہوں نے اس کتاب کے مسودے کی اشاعت کے لئے مالی اعانت منظور فرمائی اور بروقت سرپرستی کے باعث اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

ان تمام معزز حضرات کے علاوہ ڈاکٹر رام پرشاد، جناب کے۔ ایم علاؤالدین

(ایڈوکیٹ) سکریٹری مدینہ پبلک اسکول، ٹیکنیکل کالج اور ہم ان تمام دوست احباب کا جنہوں نے "القصہ مختصر" کی طباعت کے سلسلہ میں قیمتی مشورے دیئے اور بڑی سرگرمی دکھائی وہ میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ دوستوں اور معزز سرپرستوں کی فہرست بڑی طویل ہے لیکن ان میں چند نام ایسے ہیں جنھیں ہم فراموش نہیں کرسکتے ان میں قابلِ ذکر مرزا بشارت اللہ بیگ صاحب، شمع زیبا صاحبہ، وجاہت اللہ خان صاحب، روشن جہاں بیگم صاحبہ، علی احمد حذقی صاحب، اور عارف الدین سلیم ایڈیٹر نیوز ٹرسٹ آف انڈیا ہیں جنہوں نے اس کتاب کی طباعت میں ہماری کمیٹی کے ہاتھ مضبوط کئے اور مفید مشورے بھی دیئے۔

مجھے امید ہے کہ "القصہ مختصر" کو اہلِ ذوق پوری دلچسپی سے پڑھیں گے اور ہم عصمت اللہ بیگ صاحب کی دیگر تصانیف بھی یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر لاتے رہیں گے۔

فقط

مصطفیٰ کے شیروانی

نائب صدرنشین

عصمت میموریل پبلیکیشنز کمیٹی

حیدرآباد

حمایت نگر

عصمت میموریل پبلیکیشنز کمیٹی مرزا بشارت اللہ بیگ، روشن جہاں بیگم، شمع دیبا، اور وجاہت اللہ خاں کی شکر گذار ہے کہ "القصہ مختصر" کے مولف عصمت اللہ بیگ پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اور اس طرح عوام کو ایک نئے زاویہ سے عصمت اللہ بیگ کو پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مرزا بشارت اللہ بیگ، روشن جہاں بیگم، شمع دیبا اور وجاہت اللہ خاں دراصل مرزا عصمت اللہ بیگ کے سلسلہ نسب سے راست نسبت رکھتے ہیں۔

خصوصیت سے مرزا بشارت اللہ بیگ پولیس ایکشن سے قبل حیدرآباد کی ادبی دنیا میں کافی جانی پہچانی شخصیت کے حامل رہے ہیں۔ موصوف مشہور ادیب و شاعر ابراہیم جلیس اور نظر حیدرآبادی کے ہمعصر رہے ہیں اور انکا اسوقت کے مشہور افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بہر حال مرزا بشارت اللہ بیگ ایک طویل عرصہ کے بعد حیدرآبادی عوام کے سامنے اپنے تاثرات کے ذریعہ پیش ہورہے ہیں وہ ہمارے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں اُن تمام سرپرستوں کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے دامے درمے سخنے اس کتاب کی اشاعت میں مددکی اور تعاون عمل کیا ہے۔

ڈیم ملک پیٹھ حیدرآباد

سوز عابدی
معتمد عصمت میموریل پبلیکیشنز کمیٹی حیدرآباد

مرزا بشارت اللہ بیگ صاحب ۔ کراچی ۔ پاکستان

ڈاکٹر شمس بابر ۔ صدر نشین } بزمِ اُردو جدہ
مسٹر شریف اسلم سکریٹری }

روشن جہاں بیگم (یو ایس اے)

شمع دیبا صاحبہ (بمبئی)

وجاہت اللہ خاں صاحب ابوظہبی (یو اے ای)

قطب النساء ہاشمی صاحبہ لاہور ۔ نقوش

○

○

القصہ مختصر یہ کہ

مرزا عصمت اللہ بیگ کو اگر یہ پتہ لگتا کہ فلاں کتاب یا رسالے میں ایک نہایت ہی نصیحت آمیز، ازکھا، دلچسپ و منفرد نسخہ چھپا ہے تو کیا مجال جو وہ مرزا صاحب سے بچکر نکل جائے۔ وہ اُسے ہر قیمت پر کسی نہ کسی طریقہ سے حاصل کر کے ہی دم لیتے۔ چاہے وہ کوئی کتاب ہو یا رسالہ۔ فارسی زبان میں ہو یا انگریزی میں۔ چاہے وہ ہندی میں ہو یا عربی میں عصمت اُس کا اِس خوبی اور عمدگی سے ترجمہ کرتے کہ پڑھنے والے کو عبارت کی روانی اور بے ساختہ پن سے ایسا لگتا جیسے یہ ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد ہے۔ سونے پر سہاگہ مرزا صاحب کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں آسان و سہل الفاظ کو خوبصورتی کے ساتھ انگوٹھی میں نگینہ کے مانند بٹھانے میں بڑا ہی کمال حاصل تھا۔

مدعا اور مقصد بیان کرنے کے بہت سے ڈھنگ ہوتے ہیں اسلوب بیان درحقیقت مزاج کا عکس ہوتا ہے۔ مرزا عصمت اللہ بیگ کا طرزِ بیان ان کی طبیعت سے ملتا جلتا ہے۔ طرزِ تحریر نہایت سہل، سادہ تصنع سے مبرا۔

شوخی اور ظرافت کی چاشنی میں ڈوبا ہوتا ہے۔

مرزا صاحب شاعر، مصنف، مولف، مترجم، صحافی اور ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی اچھے آرٹسٹ بھی تھے۔ اس لئے اُن کی نظر چیزوں کے قد و خال اور مختلف پہلوؤں پر چاہے وہ کھلے ہوں یا ڈھکے چھپے۔ جہاں کوئی نکتہ کی بات ہوتی اور جس پر عام نظریں سرسری طور سے گزر جاتی ہیں مرزا صاحب اس کو اپنے قلم کے زور سے کھینچکر منظر عام پر لیے آتے۔

القصہ مختصر میں اگر مرزا صاحب کے تحریر کردہ تمام کے تمام قصے شامل کئے جائیں تو ایسی صورت میں یہ کتاب ہزاروں صفحات پر مشتمل ہوگی۔

مرزا عصمت اللہ بیگ نے بہت کچھ لکھا اور ہر موضوع پر لکھا۔ بچوں کے لیے لکھا۔ بڑوں کے لیے لکھا۔ حتٰی کے بوڑھوں کے لئے تک لکھا۔ بچوں کے لئے جو لکھا اور جو کچھ چھپا اُن کے پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے عصمت کو بچوں کے لئے درسی کتابیں یا دلچسپ اور صاف ستھری کہانیاں لکھنے میں ید طولٰی حاصل ہے۔ نوجوان کے لئے جو کچھ لکھا اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بجز نوجوان طبقہ کے کسی اور طبقہ کے لئے لکھ ہی نہیں سکتے ہیں۔ بوڑھوں اور عمر رسیدہ اشخاص کے لئے جو چھوٹی چھوٹی کہانیاں انہوں نے تحریر کیں ان کے دیکھنے سے ایسا محسوس ہوگا کہ وہ عمر کے انسانوں کو بھی نصیحت کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

حکیم معشوق علی خاں جوہر مرزا فرحت اللہ بیگ اور غلام یزدانی صاحب کی سوانح کو اس دلکش، دلچسپ اور ایسے انوکھے انداز میں تحریر کیا ہے کہ پڑھنے میں واقعی لطف آجاتا ہے۔ حالانکہ سوانح حیات کا اندازِ تحریر مختلف ہوتا ہے اور اس کا تسلسل کا ڈھنگ بھی نرالا ہوتا ہے۔ عصمت نے اس قید و بند کو توڑا اور اس انداز سے سوانح شروع کی جیسے وہ کوئی سوانح نہیں بلکہ ایک طویل ترین خوبصورت سا افسانہ ہے۔ حکیم معشوق علی خاں جوہر کو پڑھکر اور اس کے دلچسپ اندازِ بیان سے متاثر ہوکر ہی مرزا فرحت اللہ بیگ کو اپنے استاد محترم ڈاکٹر ڈپٹی نذیر احمد کی سوانح حیات لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

سچ تو یہ ہے کہ مرزا عصمت اللہ بیگ ہر فن مولا تھے۔ اور ہر فن پر انہیں پورا پورا عبور حاصل تھا۔ القصہ مختصر کے بعد بھی اور کئی القصہ مختصر باقی ہیں جو کیو (Q) میں کھڑے اپنی طباعت کا شدت اور بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

مرزا بشارت اللہ بیگ
کراچی - پاکستان

●

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے شہر حیدرآباد کی جانی پہچانی ممتاز شخصیت جناب نواب طاہر علی خاں کی زیر سرپرستی اردو کے مایہ ناز صاحبِ طرز ادیب مرزا عصمت اللہ بیگ کی شاہکار کہانیوں پر مشتمل تصنیف کی اشاعت عمل میں لائی جارہی ہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ کے رشحاتِ قلم خاصہ کی چیز ہیں۔ مرزا صاحب کو طرافت میں یدطولیٰ حاصل تھا، اردو نظم و نثر دونوں اصناف میں انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ نے مزاحیہ ادب میں قابلِ لحاظ اضافہ کیا ہے وہ اپنے پیچھے مزاحیہ ادب کا بیش بہا سرمایہ چھوڑا ہے اس کی طباعت کا اہتمام عصمت میموریل پبلیکیشنز کمیٹی کے سر ہے جسکو بڑی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے میں کامیاب کوشش کر رہی ہے ملک کے اس ادیب کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کا واحد یہی ایک طریقہ ہے۔

ڈاکٹر شمس بابر
صدرنشین

شریف اسلم
سکریٹری - بزم اردو جدہ

•

میرے والد محترم مرزا عصمت اللہ بیگ کی پوری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، اُن کی محبت کا سبب صرف پیاری اُردو ہی تھی۔ وہ ایک خاموش اردو ادب کے خدمت گذار تھے، شہرت کی خواہش اور خودستائی سے ان کا دُور سے بھی واسطہ نہیں تھا، ان کی طبیعت میں ظریفانہ عناصر بے پایاں تھے۔ وہ سرمحفل ظریفانہ گفتگو کے ماہر تھے، انہوں نے اردو زبان کے لئے بے شمار مضامین لکھے، جب دکن ریڈیو کے نشریات کا آغاز ہوا تو انہوں نے ریڈیائی تقریروں کو فروغ دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا، انہوں نے نثر اور نظم دونوں میں اپنا ایک مخصوص مزاحیہ اسلوب پیدا کیا، انہوں نے ضعیفی کے ساتھ برابر جنگ جاری رکھی آخر کار ۲۸ر اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ادبی دنیا میں انہیں اپنی بے شمار تصانیف کے لئے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے۔ آمین۔

روشن جہاں بیگم
یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ

●

مرزا عصمت اللہ بیگ کا شمار اردو کے مایہ ناز ادیبوں اور ممتاز مزاحیہ نگاروں میں ہوتا ہے "القصہ مختصر" کے نام سے عصمت اللہ بیگ کے مزاحیہ مختصر مضامین کا ایک انتخاب زیر اشاعت ہے۔ اس مجموعہ میں مولف کی دلچسپ ترین تخلیقات کا ایک بہترین انتخاب ترتیب دیا گیا ہے۔

مزاحیہ ادب میں مرزا عصمت اللہ بیگ ایک منفرد طرز نگار ادیب ہیں اردو ادب میں اس انداز کا مزاحیہ مضامین کا انتخاب پہلی بار منظر عام پر لایا جارہا ہے۔ مرزا عصمت اللہ بیگ کا ہر مضمون آپ سے مسکراہٹ کی داد وصول کرے گا۔ یہی ایک بات ہے جو مزاحیہ ادب میں منفرد اور بے مثل ہے جو "القصہ مختصر" کی امتیازی خصوصیت رہے گی۔

مرزا عصمت اللہ بیگ کے طنزیہ و مزاحیہ انشائیوں کا نہایت دلچسپ و نادر انتخاب جس میں مرزا عصمت اللہ بیگ کے قلم سے لکھے ہوئے وہ مضامین ہیں جس میں طنز و مزاح کو ایک خوبصورت موتیوں کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ ظریفانہ ادبیات میں یہ کتاب ایک قابل قدر اضافہ ہے مصنف کے دلچسپ، غیر مطبوعہ اور کمیاب تحریروں کو نہایت اہتمام کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے، مزاحیہ و طنزیہ تحریریں اردو ادب کی آبرو ہیں۔ مرزا عصمت اللہ بیگ کے جذبات کی یہ ایک بے مثل

دستاویز ہے۔

مرزا صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی ہر کہانی مزاحیہ ادب کا ایک نیا آئینہ خانہ ہے جس میں وہ تمام نقوش اور ہر کردار کا عکس موجود جو آپ دیکھنا چاہتے ہیں، بس یہی اس کا مختصر سا تعارف ہے۔ "القصہ مختصر" طنز و مزاح سے مزین لطیف ظریفانہ ادب کا یہ دلچسپ مرقع جو جلد از جلد آپکے ہاتھوں میں ہوگا۔ اب یہ زیر ترتیب و زیر اشاعت ہے۔

فلمستان اسٹوڈیو
گورے گاؤں
بمبئی۔

شمع دیبا

●

اُردو ادب کے مشہور و ممتاز مزاحیہ نگار جناب مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب کی فطرت میں چونکہ بذلہ سنجی، زندہ دلی اور ظرافت کے جذبات کی فراوانی تھی اسی لئے صاحبِ موصوف نے ظریفانہ میدان اختیار کیا بلکہ برسوں کی ذہنی مشقت کے بعد ایسی شہرت اور ناموری حاصل کی اور مزاحیہ ادب کا ایسا گراں سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑے ہیں جو مدتوں مزاحیہ ادب کی زینت بنا رہے گا۔

عصمت اللہ بیگ صاحب نے اپنے مضامین اور مقالوں میں سماجی مفسدات "SOCIAL EVILS" پر بڑے لطیف انداز میں چوٹیں کی ہیں۔

ہمارے سماج کے بعض مسائل اور اہم امور پر طنزیہ انداز میں ایسی روشنی ڈالی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ یقین ہے کہ اہلِ علم و صاحبِ ذوق حضرات "القصہ مختصر" کا پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کریں گے۔

وجاہت اللہ خان

ابو ظہبی (یو اے ای)

●

کائنات کی وہ پیچیدہ، گراں قدر تخلیق جس پر خالقِ ازل کو بھی ناز ہو، باریک اور گہرا مطالعہ چاہتی ہے۔ انسان کو جاننا، پہچاننا کوئی آسان کام نہیں۔ ہم دن رات انسانوں میں رہتے بستے، اُن کے میٹھے بول، پر مذاق اور برجستہ جملے سنتے ہیں، اُن کے طور طریق دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی اُن کی انفرادیت مختلف اسباب اور واقعات سے ایک لخت ہمارے سامنے عیاں ہو جاتی ہے، پھر بھی زاویہ نظر کی صحت کامل نہیں ہو سکتی، یہ کام یوں بھی اور مشکل ہو جاتا ہے کہ ہر انسان سماجی اعتبار سے ایک نقاب اوڑھے رہتا ہے، اس کی داخلی اور خارجی زندگی میں بین تفاوت ہے، شاذ و نادر کوئی من چلا بے نقاب نظر آ جائے، ورنہ اصلیت اپنے اصلی نقوش میں ظاہر ہونا نہیں چاہتی۔

لیکن وہ لوگ جو انسانیت کے خادم ہیں، علم و ادب کے پیاسے ہیں، صداقتوں کو ٹٹولنے اور حقیقتوں کو جاننے کے لئے بے چین رہتے ہیں، اس کے مستحق ہیں کہ اُن کا تعارف عوام سے کرایا جائے، یعنی انسانی تمناؤں اور آرزوؤں کو پا لینے والی وہ ہستیاں نہ صرف قابلِ ستائش ہی نہیں بلکہ قابلِ تعارف بھی ہیں، میں آج اِسی جذبہ کے تحت ذیل کا ایک مختصر سا تعارف قارئین سے کرانا چاہتی ہوں وہ بھی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مدیر "تعویق"

(لاہور) کی خواہش پر اِس مشکل مسئلہ پر میں نے اپنا قلم اٹھایا ہے۔ اِدھر میں نے قلم اٹھایا اُدھر معلوم ہوا کہ مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب اِس چلتی پھرتی دنیا سے رخصت ہوگئے، آہ، کیا ہستی تھی! ان کے بات کرنے کا انداز، شعر پڑھنے کا طریقہ، نثر لکھنے کا سلیقہ۔ کوئی سنجیدہ، علمی محفل اُن کے بغیر سونی ہوجاتی۔ وہ ہر مجلس کے روحِ رواں تھے۔

علمی ادبی محفلیں عوام کو زیادہ دیر تک دماغی کاوشوں میں پھنسائے رکھنے میں اکثر ناکام رہتی ہیں سنجیدہ سے سنجیدہ صاحبِ فکر بھی اس الجھن سے گھبرا جاتے ہیں اور کچھ تنوع تلاش کرتے ہیں۔ جہاں مجلس پر یہ حالت طاری ہوئی اور صدرِ مجلس نے مرزا صاحب کو کھڑا کردیا دیکھتے ہی دیکھتے محفل کا رنگ بدل گیا۔ ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور ہر شخص ہنستا ہنسا تا پایا گیا۔ وہ گرما گرمی اور مرزا صاحب کی وہ دلنشین لَے اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

مرزا صاحبؒ ظریف ادب کے مردِ میدان تھے، آج حیدرآباد تو کیا دنیائے ادب میں اُن کا کوئی بدل نہ مل سکے گا۔ میں نے اُن کو قریب سے بھی دیکھا اور دُور سے بھی۔ میں ہر وقت یہی سوچتی رہی کہ یہ قدرت کا کتنا زبردست شاہکار ہیں۔!

اُردو دانی کا ذوق، سلیقہ سے انگریزی الفاظ کی کھپت، بات میں بات پیدا کرنے کا انداز، پاکیزہ اور لطیف ظرافت، جس کا اثر عوام اور خواص دونوں

پڑھ ہوتا تھا مرزا صاحب کو مصوری ونقاشی سے بھی فطری لگاؤ تھا، میں یہاں ان کی شخصیت کی ایک عام جھلک دکھانے کی کوشش کرونگی اگر ان کے علمی وادبی کارناموں کا جائزہ لوں تو یہ ایک ضخیم کتاب بن جائے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اکبرالہ آبادی کا ایک جانشین سماجی خامیوں اور غلط چیزوں کی خبر لے رہا ہے، لیکن اکبرالہ آبادی کی طرح کھلم کھلا وقت سے انحراف کرنے کے عادی نہیں تھے۔ بلکہ مرزا صاحب کے حسنِ طلب کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ پوری قوت سے دیتے تھے اور اپنی ظرافت کے باریک تاروں سے اُلجھی اُلجھی گتھیوں کی گرہ کھول کر رکھ دیتے تھے، اُن کی کوئی نظم یا نثر اُٹھا لیجئے۔ اس میں وہ حال سے باخبر ماحول سے بے چین اور صداقت کی تلاش میں ملیں گے۔ یا یوں کہہ رہے ہیں ؎۔

"بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے" ان کی متلاشی آنکھیں دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتی تھیں۔ ہنستے کم تھے ہنسلاتے زیادہ تھے، ان کے مضامین کے تمام صفحات اندازِ تمسخر میں سچی باتوں سے بھرے ملتے ہیں، ہم نے ایک بڑے ادیب اور خاموش فنکار کو کھو دیا۔ ان کی موت بھی ایسے ہوئی جیسے وہ ہماری محفل سے اُٹھ کر پردہ کے پیچھے چلے گئے اور ہم اُن کی راہ تکتے تکتے اپنا ہی مُنہ تکنے لگے ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

قطب النساء ہاشمی

ماخذ نقوش، لاہور
(شخصیات خصوصی نمبر) ۱۹۵۶ء

بازاری دوافروش

اگر آپ بازاری دوافروش کو دیکھنا چاہتے ہیں تو دن کے کسی وقت شہر کے گنجان حصے یا کسی مشہور بازار میں چلے جائیے۔ وہاں آپ کو کئی بزرگ ہاتھوں میں شیشیاں دبائے کڑک کڑک کر آوازیں نکالتے ہوئے اور لہک لہک کر اشعار پڑھتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ بس یہی بازاری دوافروش ہیں۔

ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے کا سقراط اور اپنے دور کا جالینوس ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ان کی چرب زبانی اور جادو بیانی دیکھنے کے قابل ہے۔ زبان قینچی کی طرح چلتی ہے، آنکھیں الگ مٹکتی ہیں اور ہاتھ پانو الگ ناچتے ہیں۔ کوئی صاحب موٹر پر کھڑے تقریر فرماتے ہیں، کوئی گاڑی پر بیٹھے شیخیاں بگھارتے ہیں اور کوئی صندوق پر کھڑے ہو کر اپنی لیاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں، جہاں دیکھا دس بارہ آدمی جمع ہو گئے اور انہوں نے اس طرح گلفشانی شروع کر دی :۔

نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

دوستو! مجھے اس حالت میں دیکھ کر آپ لوگ کوئی معمولی نقش

نہ سمجھ لینا۔ میں کبھی خدا کے فضل سے اور بھگوان کی کرپا سے لکھ پتی کا ایک پتر ہوں۔ مگر پبلک کی خدمت کرنے کا شوق اور سیوا کرنے کا ذوق ہے اس لیے میں نے اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے۔ شاعر کہتا ہے :-

ہوتے سیرت سے ہیں مردانِ دلاور ممتاز ؛ ورنہ صورت میں تو شہباز سے کچھ کم نہیں چیل

اور کہتا ہے :-

شوقِ ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا ؛ قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

اور کہتا ہے :-

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری ؛ کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

اِس مختصر سی تمہید کے بعد میں آپ کی خدمت میں وہ بے مثل دوا پیش کر رہا ہوں جس کو دیکھ کر چین ماچین، جرمنی ارمنی، جاپان ترکستان، امریکہ، آفریقہ اور پاکستان و عربستان سب کے سب لرزہ براندام اور انگشت بدنداں ہیں۔ اس دوا کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ اگر مُردے کے حلق میں ڈال دی جائے تو پہلی خوراک میں اُس کے تمام شریانوں میں بجلی دوڑ جائے گی۔ دوسری خوراک میں ہاتھ پانوں میں حرکت پیدا ہوجائے گی اور تیسری خوراک میں تو آپ یقین مانیے کہ وہ کفن پھاڑ کر بھاگنا شروع کردے گا۔ شاعر کہتا ہے کہ

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ ؛ ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانوں

پرنتو شرط اتنی ہے کہ مُردے کا شریر بے ٹھنڈا نہ ہونے پائے اور طائرِ روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے ایک گھنٹہ اندر باہر پہلی ایک خوراک

حلق میں ڈال دی جائے۔ شاعر کہتا ہے :

مانی مانی سب کہیں، دمانی نہ جانے کوئی ؛؛ مانی سے جو ناگ رہے تو بال نہ بیکا ہوئی

ترجمہ :- اس دوا کے کھاتے ہی منش شروع ابقہ ہو جاتا ہے۔ یعنی بھوک اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ انسان کنکر پتھر چبانے شروع کر دیتا ہے اور معدے میں اتنی شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ لوہے، پتھر اور فولاد کے ٹکڑوں کو بھی ہضم کر جاتا ہے ۔ یہ دوا ذیابطیس، کھانسی، نزلہ، زکام، دردِ سر، دردِ دل، دردِ جگر، امراضِ چشم، امراضِ کہنہ، پلیگ، ہیضہ، کالا بخار، گردن توڑ بخار، غرض یہ کہ جملہ امراضِ جسمانی اور روحانی، انسانی اور حیوانی کے لیے تیرِ بہدف، مجرّب المجرب اور سریع التاثیر ہے۔ شاعر کہتا ہے :-

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ؛؛ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اگر تمہارے ہردے میں نین اور گردن میں آنکھیں ہیں تو اس دوا کو غور سے دیکھو جس کو میرے گرو جی نے ہمالیہ پربت کی سب سے بلند چوٹی پر بیٹھ کر ناگ پنچمی کے دن پتال جنتر کیا ہے۔ مسلمان بھائیوں کو ایمان کی قسم اور ہندو بھائیوں کو دھرم کی سوگند دے کر کہتا ہوں کہ یہ دوا سر سے پاؤں تک دیسی ہے جس کی تصدیق بڑے بڑے لیڈر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس میں ہزاروں دیسی بوٹیوں کے علاوہ دو سیر سنکھیا، بارہ تولہ سم الفار، دس تولہ رس کپور، آٹھ تولہ کچلا، دس تولہ نیش عقرب جرارہ اور پندرہ تولہ خالص دیسی زہروں کی روح موجود ہے۔

اگر کسی کے معدے میں گیس اور دماغ میں بھس بھر گیا ہے یا خدانخواستہ

دل کی جگہ جگر اور جگر کی جگہ مثانہ منتقل ہوگیا ہو تو چلو آگے بڑھو اور نین بند کرکے
اِس دوا کو نوشِ جان کر جاؤ۔ اِس لیے کہ

وقت پر قطرہ بہت ہے ابرِ خوش انجام کا ؎ جل گئی کھیتی اگر برسا تو پھر کس کام کا

اس دوا کی دوسری تاثیر یہ ہے کہ پتھر کو پانی اور پانی کو خون بنا دیتی ہے۔
دیکھئے! اِس گلاس میں جل ڈالتا ہوں۔ ذرا نین جما کر دیکھئے اور بولیے کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟

پہلا تماشائی : اِس کا رنگ سفید ہے۔

دوا فروش : اور اب بولیے اس کا رنگ کیسا ہوگیا۔

دوسرا تماشائی : اِس کا رنگ لال ہوگیا۔

دوا فروش : دیکھے جادوگر کا کمال ڈالے سفید نکالے لال
دیکھئے اس کا رنگ لال ہوگیا یعنی پانی مثل گلال ہوگیا۔ شاعر کہتا ہے۔

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور ؎ دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

دوستو جس طرح دوا کے ایک قطرے نے پانی کو خون بنا کر رکھ دیا۔ اُسی طرح صرف ایک خوراک سے جسم میں شرابِ ارغوانی کی طرح سُرخ خُون دوڑنے لگے گا۔ شریر کُندن کی طرح چمکنے لگے گا اور چہرہ چُقندر کی طرح لال ہوجائے گا۔ شاعر کہتا ہے:

لال مُنہ ہوگیا غصے سے نہ کھانا کھایا ؎ دیکھا مرزا نے جو پکے ہیں چُقندر خالی
اور کہتا ہے۔

چشمِ نرگس زلف سنبل گالِ گل بستاں انار ؛ گورٹ کرتی کی ہے یا دیوارِ بستاں کمر
سرخ پاجامہ نہیں پہنا ہے اس سفاک نے ؛ سر پہ چڑھتے کو چڑھا خونِ شہیداں تا کمر

دوستو! میرا دعویٰ ہے کہ سو برس کا بڈھا کھونسٹ ایک خوراک میں بیس برس کا نوجوان گبرو بن جائے گا اور بیس سالہ نوجوان شیر خوار بچہ کی طرح زمین پر رینگنے لگے گا۔

یہ دوا ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا پارسی، کوآپریٹر ہو یا نان کوآپریٹر روگی ہو یا ترِدگی، بیمار ہو یا تندرست، مردہ ہو یا زندہ سب کے لیے یکساں مفید ہے۔ تندرست آدمی کے لیے ایک شیشی مرتے دم تک کافی ہے بیمار کے لیے نصف شیشی چہلم تک کام دیتی ہے اور جو شخص بسترِ مرگ پر پڑا ہوا دم توڑ رہا ہے اُس کے لیے صرف پاؤ شیشی درکار ہے۔ دو چار قطرے حلق میں ڈال دیجیے اور باقی دوا کفن پر چھڑک کر قدرت کا تماشہ دیکھیے۔ شاعر کہتا ہے:

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں ؛ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

بیرونی روگوں کے لیے ضماد کیا جائے، اندرونی بیماریوں کے لیے جوشاندے اور جساندے کی طرح استعمال کیا جائے۔ دانتوں میں درد ہو۔ دانت ہلتے ہوں مسوڑے پھول گئے ہوں تو تھوڑی سی دوا انگلی پر ڈال کر رگڑیے انشاءاللہ ایک رگڑے میں ہلتے ہوئے دانت آئسکریم کی طرح جم جائیں گے۔

بانکیلا تماشائی : اور حکیم صاحب اگر دانت گر کر ٹوٹ گیا ہو تو؟

دوافروش : تو اس دانت کو دوا میں تر کر کے پھر منہ میں چپکا لو۔

بھگوان کی کرپا سے اس طرح بیٹھ جائے گا جس طرح
انگوٹھی میں نگینہ ۔

اچھا دوستو! یہ دیسی اور پردیسی ادویات کا سرتاج شہرہ آفاق ہے
اس کا رجسٹر نمبر چھتر اور ب - بارہ کروڑ دو سو بارہ ہے ۔ دوسری پہچان یہ ہے کہ
اس پر مردہ یعنی اسکیلیٹن کا ٹریڈ مارک بنا ہوا ہے اور دنیا کی سات زبانوں
میں اس کا نام لکھا ہوا ہے۔

اب لگے ہاتھوں اس کی قیمت بھی سُن لیجئے ۔ شاعر کہتا ہے :۔
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ ؛ لیکن معیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

دوستو ! میرے گُروجی کے حکم کے مطابق مجھے اس دوا کی ایک کوڑی
لینا بھی حرام ہے مگر شیشی کی قیمت ، لیبل کے دام ، انکم ٹیکس ، سیل ٹیکس
اور پروفیشنل ٹیکس سب ملا کر چار آنے چھ پائی ہوتے ہیں ۔ وہ چھ پائی
تو میں معاف کرتا ہوں اب جو صاحب چار آنہ دیں گے صرف اُن کو ہی یہ دوا
مفت تقسیم کردی جائے گی۔

پہلا تماشائی : حکیم صاحب! مجھے نیند بہت آتی ہے
دوا فروش : نہ گھبراؤ ۔ ایک خوراک پینے کے بعد انشاءاللہ
عمر بھر نیند نہیں آئے گی۔
دوسرا تماشائی : اور حکیم صاحب میرا دل بہت جلتا ہے
دوا فروش : تم بھی یہی پیو۔ انشاءاللہ دل جلنا بالکل بند ہو جائے گا۔

بازاری دوا فروش کی یہ چرب زبانی دیکھ کر ہر شخص نے فوراً چلو چار آنے جیب سے نکالے۔ اس نے ایک ہاتھ سے چار آنہ لیے اور دوسرے ہاتھ سے دوا کی شیشی دے کر یہ شعر پڑھا۔

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سود انقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

دیکھتے ہی دیکھتے ساری کی ساری بھیڑ چھٹ گئی اور ہر کس و ناکس ہاتھوں ہاتھ دوا کی شیشی لے لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ مگر بازاری دوا فروش، وہیں فرش پر بیٹھ گیا اور خوردہ گننے لگا۔

خدا معلوم اُن بیچارے خریداروں پہ کیا گذری؟
مگر ہمارے بازاری دوا فروش کے پورے بارہ ہو گئے!

پتہ چلا کہ کچھ اُوپر ۳۰ - ۳۵ روپیوں کا خوردہ بیگ میں کھنک رہا ہے۔!

القصہ مختصر، یہ رہی بازاری دوا فروش کی سرگذشت اور یہ رہی اُنکی چلتی پھرتی حکمت۔

اللہ کا خیال نہ بندے کی فکر ہے
ہر مبتلائے فکر کو دھندے کی فکر ہے
حاضر ہے جانِ قوم کی۔ لیڈر کے واسطے
لیڈر کو قوم کی نہیں چندے کی فکر ہے

گریٹ پامیٹ

ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتلانے والے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو تیلی راجہ کے نام سے مشہور ہیں اور دوسرے وہ جو خود کو فارچون ٹیلر یا گریٹ پامیٹ کہتے ہیں۔

تیلی راجہ ستاروں کی طرح دن بھر چکر لگاتا رہتا ہے۔ عام طور پر بڑے سویرے ایک اکتارہ یا ڈگڈگی ہاتھ میں لے کر نکلتا ہے جو اُس کی آمد کا راگ گاتی اور ڈنکا پیٹتی رہتی ہے۔ جب وہ کچھ مُنہ سے بولتے ہیں تو یہ خاموش ہو جاتی ہے اور جب ڈگڈگی کچھ بولتی ہے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔

تیلی راجہ کے الفاظ بندھے ٹکے ہیں۔ چاہے وہ کسی کا ہاتھ دیکھے یا نہ دیکھے یہ بینٹ جملے برابر بولتا چلا جاتا ہے۔

فتح ہوں گی، فائدے رہیں گے، معاملے نبٹیں گے، ترقیاں آئیں گی ستارے نیک، مقدّر اچھے، خوشی ہوں گی، بول بالے رہیں گے، سوا سو برس کی عمر رہے گی ——— نک شتر پہلا، منگل پانچواں، راہو کیتو ساتواں، برج آٹھواں، ستارہ دوبارہ ہے، دِل اچھے ہیں۔ ابھی ایک کام پر دل رکھے ہیں۔ وہ

کام تو ہو جائے گا مگر ہاتھ میں مچھلی کا برک نکلا ہے بر دشمن پنپنے نہیں دیتا۔ عمر بڑی ہوگی آپ کی، کوٹھے سے بھی نیچے گرے تو مرنے والے نہیں مگر جمعرات کے دن پھول شکرداعۃ نے خواجہ قلندر میں چھوڑ دیے۔

ان تیلی راجاؤں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اندھوں میں کانا راجا ہیں ان کے کپڑے بھی صاف ستھرے رہتے ہیں زبان بھی ٹھیک ہوتی ہے اور باتیں بھی ایسی گول مول کرتے ہیں کہ اچھے اچھے چکر میں آجائیں۔ ۵ بجائے ادھر ادھر گشت کرنے یا چکر لگانے کے، سڑک کے کنارے انگریزی اخبار کا فرش کرکے بیٹھ جاتے ہیں اور جن لوگوں کے ستارے گردش میں ہیں وہ خود چکر کھاتے ہوئے ان کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

یہ لوگ فارچون ٹیلر یا گریٹ پامسٹ ہیں۔ ان کے سامنے بخشی جنتری کی پرانی جلدیں، کیرو کی پھٹی ہوئی کتاب، ایک آتشی شیشہ اور ایک پنجہ یعنی ہاتھ کا خاکہ پڑا رہتا ہے۔ جسے دور سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا پنجاب کے پانچ دریا بہہ رہے ہیں۔

اب سنیے! ایک گریٹ پامسٹ ہمارے متھے بھی چڑھ گئے۔ خوش قسمتی سے ان کے لیے کافی مال مسالہ موجود تھا۔ یعنی ہمارے پاس ایک اعلیٰ قسم کا بن مانس تھا اور انسانی سلسلے کی ابتدائی کڑی ثابت کرنے کے لیے ہم نے اس کے ہاتھ کی تصویریں بھی بنائی تھیں جس میں ہتھیلی کی گدیاں انگلیوں کے پورے گائیاں پانچوں انگلیاں ان کے ابھار اور تمام لکیریں اور خطوط واضح طور پر دکھائے تھے۔

...ہاتھ کی تصویر لاکر ہم نے باپیسٹ صاحب کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ یہ ہمارے سرکار کے ہاتھ کا چھاپا ہے اگر تم نے صحیح صحیح اور پتے کی باتیں بتادیا تو پھر ہمارے سرکار خود یہاں تشریف لائیں گے اور اپنے ہاتھ سے تمہیں انعام دیں گے۔

انعام کا سُن کر جوتشی صاحب کی کانوں تک باچھیں کھل گئیں۔ فرمانے لگے حضور! ہم تو لکیر کے فقیر ہیں۔ جو لکھا ہے وہ بتائیں گے اور سرکار! بندر کا حال مچھندر ہی جانتا ہے دوسرا بھلا ان لکیروں کو کیا پا سکتا ہے۔ تو حضور! سرکار کے ہاتھ پر تو بان ہیں۔ مزاج تو سرکار کا بہت گرم ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیں گے۔ جو خود کہیں تو سب کچھ اور دوسرا بولے تو غصے میں آکر منہ نوچ لیں گے۔

ہاتھ کی گدیاں تو اُبھری ہوئی ہیں۔ سرکار کی طبیعت تو بندر کی ٹوپی ہوگی گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، راج تو ہوائی ہے، پاؤں میں پارہ ہے، ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے والے نہیں۔

آج یہاں کل وہاں گزرے یوں ہی جگ ہیں
لوگ اسی واسطے کہتے ہیں پری چگ ہیں

سیر سپاٹے کا شوق ہوگا۔ طبیعت ایک جگہ نہیں لگے گی۔ کھانے پینے کے شوقین ہوں گے اور میوہ تو ان کا من بھاتا کھاجا ہوگا۔ کچا ہو یا پکا یہ مزے لے لے کر کھائیں گے۔ رزق کی کمی نہیں جہاں رہیں گے وہ خود چھپر کران کے سامنے آجائے گا

دھن ریکھا تو بہت اچھی ہے۔ دھن دولت کو ٹھوکر ماریں گے۔ روپیہ پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھیں گے۔ دل غنی رہے گا سونے چاندی کو مٹی اور ہیرے جواہر کو خاک پتھر کے برابر سمجھیں گے۔ ان کی بدولت دوسرے دولت کمائیں گے۔ مگر یہ ننگے کے چنگے اور اپنے حال میں مست رہیں گے۔

مشتری اونچا ہے۔ بڑے اونچے بھاگ ہیں۔ رامچندر جی کی کرپا ت جہاں جائیں گے لوگ عزت کریں گے اور انہیں سر دل پر بٹھائیں گے۔ مگر ایک سفر کا ارادہ ہے۔ بندرابن کی طرف جائیں گے تو بڑا فائدہ اٹھائیں گے۔

پھر شادی کی لکیر یں دیکھ کر کہنے لگا کہ سرکار برا مت ماننا۔ جوڑے کی لکیریں تو بہت ہیں مگر سرکار ان کے چکر میں آنے والے نہیں۔ بچوں کی تو پرمیشر کی کرپا سے گنتی نہیں ہے۔ پرنتو بچے ان سے فائدہ اٹھائیں گے مگر ر۔ بچوں سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔

دل کی ریکھا تو بہت بڑی اور چوڑی ہے۔ بڑے دل والے ہیں۔ بڑے بڑوں کی پروا کرنے والے نہیں۔ رستم بھی سامنے آجائے تو یہ ڈرنے والے نہیں۔ سرکار کی ایک بندر بھبکی میں وہی گھبرا کر زک دم ہوجاتے مگر سرکار گھبرانے والے نہیں لیکن ذرا ہٹی (ضدی) ہیں۔ جو من میں آگیا وہ کرنے والے۔ لوگ باگ ان سے محبت کریں گے مگر یہ کسی سے محبت رکھنے والے نہیں۔

شنی (آفتاب) کا برج تو ابھرا ہوا ہے۔ ریکھا بھی اُتم ہے۔ سرکار کو اونچی جگہ ملے گی۔ دور دور سے لوگ درشن کرنے آئیں گے۔ مگر حضور اپنی

مشہور ہے بندر ناچے اونٹ جل مرے۔ دشمن جلیں گے مگر سرکار کا بال بیکا نہ کر سکیں گے۔ بڑی بڑی کتابوں میں ان کا نام ہو گا مگر نہیں نام نمود کی پروا نہیں ایسی کتاب ان کے ہتھے چڑھی تو پھاڑ کر پھینک دیں گے۔

سرکار کی عمر کی ریکھا تو لمبی چلی گئی ہے۔ بہت بڑی عمر ہو گی۔ پہاڑ کی چوٹی سے بھی گریں گے تو پرمیشر کی کرپا سے کوئی دھکا نہ لگے گا۔ پرنتو بالک پنے میں ایک گنڈم ہے یہ اپنے ماتا پتا سے لڑکر باہر نکل جائیں گے۔ جوانی میں پھر دوسرا گنڈم ہے۔ کسی معاملے میں دل لڑنا پڑے گی مگر دشمن کے مقابلے میں ور رہیں گے۔

حضور! سرکار کا خون کچا ہے ذرا سا زخم بھی بندر کا گھاؤ ہو جائے گا۔ مگر فکر نہیں تندرستی کی ریکھا چوکھی ہے۔ سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ہتھیلی مضبوط اور ہاتھ چوکور ہے۔ کثرت کے شوقین ہوں گے جھاڑ بندر، اچک کود، بھاگ دوڑ، بانک بنوٹ، تیراکی، لانگ جمپ اور ہائی جمپ میں کوئی سرکار کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ مرغ کی بانگ کے ساتھ اٹھیں گے۔ بڑے سویرے، جنگل اور باغوں کے چکر لگائیں گے۔ پرنتو ہاتھ میں گدھا ہے۔ روپیہ ہاتھ میں نہیں ٹکے گا۔ دل غنی ہے فکر نام کو نہیں۔ کھیل کود اور سیر سپاٹے کی طرف طبیعت زیادہ رہے گی۔

مریخ کا برج ابھرا ہوا ہے۔ سرکار لڑاکو ہوں گے۔ بات بات پہ کاٹنے دوڑیں گے۔ چندر برج بھی ابھرا ہوا ہے۔ سرکار ناچ رنگ اور

بھروپ بھرنے کے شوقین ہوں گے۔ نقل تو ایسی کریں گے کہ اصل کو بھی مات کردیں گے۔ ہر چھوٹا بڑا' امیر فقیر انہیں اپنے ہاں مہمان رکھنے کی تمنا کرے گا۔ مگر یہ ہمیشہ رسی توڑ کر بھاگنے کی فکر میں رہیں گے۔ وہ کھلے میدانوں اور ہرے بھرے باغوں میں رہنا پسند کریں گے اور اونچے اونچے سرسبز مقاموں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر اپنا استھان بنائیں گے جہاں صاف ستھری ہوا' ہرے بھرے درخت' پھل پھلاری کے باغ اور میٹھے پانی کے چشمے بہہ رہے ہوں گے اور پانی موتی کی طرح کنٹھوں میں جگ مگ جگ مگ کر رہا ہوگا۔

اس کے بعد کہا لائیے سرکار۔ سرکار کے ہاتھ سے چاندی کا چراغ دلوائیے۔ پھر پانچ انگلیاں بتا کے کہا۔ دیکھیے پانچ روپے سے کوڑی کم نہ لوں گا۔ ہم نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے۔ ہم ڈھیرے سے اٹھے اور اپنے بندر کی زنجیر پکڑ کر ان کے سامنے لائے اور کہا کہ جن سرکار کی قسمت کا حال تم نے ابھی بتایا ہے وہ یہی ہیں۔

بن مانس نے اسے دیکھ کر ایک بندر بھبکی بتائی اور تیزی سے جھپٹا۔ جوتشی مہاراج اپنا طبلق چھوڑ کر بھاگے تو ان کی پہلی ٹکر تو دروازے کی چوکھٹ سے ہوئی۔ آگے بڑھے تو پتھر سے ٹھوکر کھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تو منہ کے بل زمین پر آرہے اور بن مانس نے ان کے طبلق پر قبضہ کر کے بھبکیوں پر بھبکیاں بتانی شروع کردیں۔

رقیب روسیاہ کا ایک ہی بھبکی میں مرجانا
یہی تو ہے طویلے کی بلا بندر کے سر جانا

▲▲

ہماری موچھیں

آپ ہندوستان کے کسی مشہور شہر کے کسی بڑے بازار میں کھڑے ہو جائیے وہاں آپ کو طرح طرح کی موچھیں نظر آئیں گی۔ کسی کی موچھ سانپ کی طرح بل کھائی ہوئی، کسی کی ناگ کی طرح پھن اٹھائے ہوئے کسی کی کنڈلی ماری ہوئی۔ کسی کی بچھو کے ڈنک کی طرح ٹیڑھی بڑنگی، کسی کی بھری ہوئی، کسی کی چھدری، کسی کی ڈاڑھی میں گھسی ہوئی کسی کی ڈاڑھی موچھوں میں لپٹی ہوئی۔ اور کسی کے ڈاڑھی موچھیں دونوں ندارد۔ بقول اکبر

ڈاڑھی موچھوں کا سب صفایا ہے
فارغ البال اِن کو کہتے ہیں

موچھیں کیا ہیں؟ یہ انسان کی قسمیں ظاہر کرتی ہیں۔ ہر موچھ ایک انسان کی قسم ہے اور ہر انسان ایک خاص وضع کی موچھ رکھتا ہے۔ جس طرح آپ انسان کا رنگ روپ اور آنکھ ناک دیکھ کر اس کی نسل کا پتا چلا لیتے ہیں بس اسی طرح موچھ کی وضع قطع سے بھی بہت سے بھید معلوم کر سکتے ہیں۔ ہر فرد اپنی موچھ پر اس سختی سے قائم ہے اور ہر شخص اس کی وضع قطع پر ڈٹا

اڑا ہوا ہے کہ گویا اس نے اپنی مونچھوں کی رجسٹری کرالی ہے یا گورنمنٹ سے پیٹنٹ حاصل کر لیا ہے۔ ممکن نہیں کہ پٹھان کی موچھ مینیا رکھے اور فوجی افسر کی موچھ سپاہی کوئی چھوٹی موچھ والا، بڑی مونچھ والے کے سامنے مونچھ نہیں چڑھا سکتا اور کوئی معمولی موچھ والا غیر معمولی مونچھ والے کے آگے مونچھ پر تاؤ نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کسی جگرے دل کے آگے اس کی موچھ کی برائی کردیں تو بس وہ اپنی موچھ کو تاؤ دے کر آگے بڑھے گا اور آپ کی داڑھی مونچھ تو رہی ایک طرف سر میں بھی دوا کے لئے ایک بال نہ ملے گا۔

کہتے ہیں کہ میری اور تیری مونچھ پر ہزاروں قتل ہوئے اور مونچھ کے اتار چڑھاؤ پر ہزاروں سولی چڑھے۔ مونچھوں کی بیسیوں قسمیں ہیں اور ہر ایک میں ایک نہ ایک خصوصیت ضرور موجود ہے۔ اس میں سے دو چار قسمیں آپ بھی سن لیجئے۔ مثلاً باگ مونچھ۔ یہ بڑے بڑے بہادر، شیر دل، بڑے بڑے بادشاہ اور جوانمرد رکھتے ہیں۔ اس کے ہر بال کے پیچ وخم میں موسیقی کا زیر و بم، دنیا کا اتار چڑھاؤ، زمانے کے نشیب و فراز اور قوموں کے عروج و زوال کے نقشے پائے جاتے ہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے :۔

مونچھوں سے کوئی پوچھے پست و بلند ہوتا
اونچی بھی ہیں کہیں پر نیچی بھی ہیں کہیں پر

بلّی کی موچھیں زیادہ تر دولت مند طبقے کے نوجوان اور نمائشی لوگ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جو ہے کی مونچھ ہے اسے عام طور پر بنیے بقال، سوداگر

چھوٹے موٹے کنٹراکٹر، ڈپٹی کلکٹر اور درمیانی طبقے کے لوگ رکھتے ہیں۔ اسی میں یار لوگوں نے کچھ تراش خراش کرکے ایک نئی وضع بھی ایجاد کی ہے جسے خشخشی بھی کہتے ہیں۔ یا تو پوری مونچھ پر قینچی چلا کر چھوڑ دیتے ہیں جو چوہے کی دُم کی طرح معلوم ہوتی ہے یا مُونچھ کے اوپر اور نیچے کے حصے کو استرے کے نظر کرکے صرف ایک مہین سا خط چھوڑ دیتے ہیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہونٹ پر مکوڑوں یا چیونٹیوں کی قطار چلی جارہی ہے۔

اس کے بعد چارلی چپلن کی مُونچھ ہے۔ اس میں مونچھ کا کون حصہ استرے کی نذر کرنا پڑتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اگر کوئی صاحب دُور سے دیکھیں تو بس انہیں یہ معلوم ہو کہ دو بڑ مکھّے نتھنوں کے نیچے چپکے ہوئے ہیں۔ اس میں یار لوگوں نے کچھ کمی بیشی بھی کی ہے۔ وہ یہ کہ جتنی جی چاہے کم کرو یا جتنا جی چاہے بڑھاؤ مگر مونچھ کی مقدار آدھی مونچھ سے بال برابر بھی کم نہ ہونے پائے اور یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رہے : کہ

ڈاڑھی گھٹاؤ خوب تر، مُونچھیں رکھو پر اس قدر
ناک میں مُرغی کا پَر آدھا اِدھر آدھا اُدھر

اس کے بعد جھینگر مُونچھ ہے۔ یہ فیشن جھینگر سے وضع کیا گیا ہے۔ چینی اس قسم کی مونچھیں بہت پسند کرتے ہیں یعنی درمیان میں کم اور نوکیں بڑی۔ موچھندر مونچھ سے تو تقریباً سب واقف ہیں۔ یہ تو ڈاڑھی کو اس بری طرح دبا لیتی ہیں کہ انسان کے منہ اور ہونٹ سب غائب ہو جاتے ہیں اور صرف مونچھ

بھی مونچھ دکھائی دیتی ہے۔ کسی کا مشہور شعر ہے

چل چل رہے مچھندر تجھے کس خبط نے گھیرا
ڈاڑھی کو منڈا دے تو ہے مونچھوں کا مکھڑا

اس کے بعد بھیڑ مونچھ کی باری آتی ہے۔ یہ شاید بھیڑ یا بھیڑیے سے لی گئی ہے۔ یہ پچھے دار، موٹی یا بکھری ہوئی ہوتی ہے مگر مچھندر کی طرح لمبی نہیں ہوتی، اس قسم کی مونچھوں کو اکثر غریب طبقے کے لوگ، دفتری ادنیٰ ملازم اور کسان وغیرہ رکھتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو یہی ایک مونچھ ایسی ہے جو طبی نقطۂ نظر سے نہایت مفید ہے۔ پانی پیتے وقت یہ اچھا خاصہ فلٹر بن جاتی ہے۔ اسے صافی مونچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں پانی وغیرہ چھن کر منہ میں جاتا ہے، نتھنوں کی حفاظت ہوتی ہے، رتی برابر بھی گرد وغبار ناک کے اندر نہیں جاتا۔ ناک کے جراثیم منہ میں اور منہ کے جراثیم ناک میں نہیں جا سکتے اور آدمی ہر قسم کی بیماریوں سے پاک وصاف رہتا ہے۔ ▲▲

۶
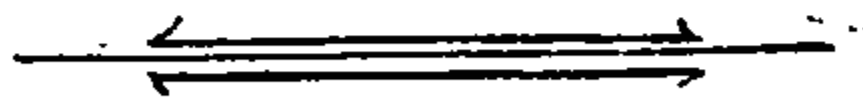
علی گڑھ کا ایک مشاعرہ

پرانے لونڈوں کے نام سے اکثر لوگ بہت چکرائیں گے مگر چکرانے کی کوئی بات نہیں ۔ انگریزی کالجوں اور مدرسوں کی عنایت سے ہماری زبان میں ایک نیا لفظ آ گیا ہے یعنی اولڈ بوائے (OLD BOY) اولڈ کے معنی ہیں پرانا، قدیم، بڈھا، کھوسٹ ۔ رہا بوائے تو اس کے معنی ہیں لڑکا بالک یا لونڈا یا لمڈا ۔ اس لیے اس کا ترجمہ پرانا لمڈا بالکل ٹھیک ہے مگر ہمارے لکھے پڑھے اور فیشن ایبل لوگ اردو کے اس لفظ کو کیوں پسند کرنے لگے ۔ وہ تو اپنے آپ کو اولڈ بوائے ہی کہلاتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں ۔

ہندستان میں سیکڑوں مدرسے اور کالج ہیں ۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سب ملا ملوکر کتنے اولڈ بوائز ہوں گے مگر عجیب بات ہے کہ جس طرح علی گڈھ کالج مشہور ہے اسی طرح علی گڈھ کے اولڈ بوائز بھی مشہور ہیں ۔ ایک زمانے سے ان کا یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ ہر سال سب کے سب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں ۔ اور ایسی ایسی لچھے دار، چٹپٹی اور مسالہ دار تقریریں کرتے کرتے ہیں کہ یار لوگ ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں، ظرافت تو یہاں اچھلتی ہے

اور قہقہے ہر ایک لفظ کا استقبال کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد مرغ پلاؤ، قورمہ اور بریانی پر ہاتھ مارتے ہیں۔ پھر رات کو ایک مشاعرہ کرتے ہیں جو کھانا ہضم کرنے کے لئے چورن کا کام دیتا ہے اور سب سے آخر میں خوردند و گفتند و برخاستند پر عمل کرتے ہیں۔

کچھ دن پہلے علی گڈھ ڈنر ہوا تھا۔ ہمیں بھی خبر ہوئی تو بقول جعفر زٹلی ہم بھی گھسر بھسر کے گھسیر م گھمساڑ ہو گئے۔ بعض لوگوں نے شبہ کی دوربین لگا کر ہمیں تاکا تو ہم نے بھی ظرافت کا چشمہ آنکھوں پر لگا کر انہیں دیدے پھاڑ کر منہ چڑا دیا اور فوراً ایک توندل سے لپٹ گئے گویا ہم اُن کے روم فیلو تھے اور ایک بڑے عہدہ دار سے کانا پھوسی کرنے لگے گویا ہم اُن کے کلاس فیلو تھے۔ اس حرکت سے وہ لوگ ٹھنڈے پڑ گئے۔

اب ہم نے دیکھا کہ یکے بعد دیگرے ایک ایک دعوتی ٹپکنا شروع ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں صحن موٹروں سے اور ہال اولڈ بوائز سے بھر گیا۔ ان میں گورے بھی تھے کالے بھی تھے، موٹے بھی تھے، ڈرھیال بھی تھے ڈاڑھی منڈے بھی تھے، بڈھے بھی تھے جوان بھی تھے، وزرائے سلطنت بھی تھے اور اعیان حکومت بھی تھے، جج بھی تھے اور ماہران قانون بھی تھے، خان بہادر بھی تھے اور جنگ دولہ بھی تھے۔ امیر بھی تھے غریب بھی تھے عہدہ دار بھی تھے اور ماتحت بھی تھے۔
ان لوگوں کو دفتروں میں دیکھو تو وضع قطع اور صورت شکل سے نہایت مُقطّع حُقطّع۔ رعب داب ایسا کہ خوش مذاقی اور ظرافت دُم دبا کے بھاگے۔ ہنسنا تو رہا

ایک طرف معلوم ہوتا ہے کہ مسکراہٹ نے کبھی بھولے سے اُن کے چہرۂ مبارک پر قدم رنجہ نہیں فرمایا اور کسی بیرونی آنکھ نے بھی ان کے مصنوعی یا قدرتی دانت نہیں دیکھے مگر اندر داخل ہوتے ہی کایا پلٹ ہوگئی۔ کانوں تک باچھیں کھلی جاتی تھیں، ظرافت قدموں پہ لوٹتی تھی، قہقہے اُن کا استقبال کرتے تھے اور بڑھاپا اپنا عصا زمین پر پٹک پٹک کر آواز لگاتا تھا کہ لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو"۔ زندہ باد علی گڈھ اور زندہ باد علی گڈھ اولڈ برائز۔

جن صاحب کے گھر میں یہ دعوت تھی انہیں پنشن لئے ہوئے کوئی دس سال ہو چکے تھے اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو اُن کا سنِ شریف کوئی ستّر بہتّر سال کا ہوگا مگر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی آپ کالج سے تشریف لارہے ہیں۔ اُچک اُچک کر اور لپک لپک کر آنے والوں کے قدم لیتے تھے اور گردنی دے کر انہیں یاروں میں چھوڑ دیتے تھے جہاں اُن کی اچھی طرح سے مزاج پرسی ہوتی، پرانے ناموں سے یاد کئے جاتے، ان کے اوصاف حمیدہ بیان کئے جاتے اور پھر اُن کی خوب گت بنتی تھی۔ مثلاً میں نے دیکھا ایک صاحب تشریف لائے۔ سفید سیاہ کھچڑی ڈاڑھی، گندمی رنگ، کلچہ کی طرح گال۔ کشتی نما ٹوپی سر پر اور ایک بھڑک دار شیروانی زیب تن کیے ہوئے۔ صورت سے خالی مغز مگر انداز سے پختہ کار معلوم ہوتے تھے، پختہ کار سے یہ مطلب کہ دعوتوں میں خیالی پلاؤ پکاتے تھے۔ پکّے قول اور پکّے پکوان سے واقف تھے، پکّی زبان اور پکّی بولی بولتے تھے۔ ناشتے پر باتوں کی کھچڑی پکانے میں مشاق تھے اور ارادے اور

دُھن کے اتنے پکے کہ وقت پڑے تو خود بھی دم بخت ہوکر رہ جائیں۔ آپ نے لکھنوی طریقہ پر صاحب سلامت کرتے ہوئے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ہر طرف سے غل ہوا آئے منے خان نان بائی۔ بس وہ اپنا پُرانا نام سن کر ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ گئے اور ڈبل روٹی کی طرح پھول گئے۔ نان بائی صاحب کے آتے ہی پھر نذم خور نذم کے انتظام عمل میں آئے وہاں بھی سب نے لمبے لمبے ہاتھ مار کر خورد و نوشش کی کارروائی ختم کردی۔ پھر سب کے سب اپنی اپنی ٹھیکی پر آ جمے۔

اب روحانی غذا کی باری آئی۔ ایک صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کرسی پر کھڑے ہوکر حکمِ نادری سنایا کہ فلاں صاحب جج مقرر کئے گئے۔ سب نے تالیاں بجا کر تائید اور پاؤں زمین پر مار مار کر تائید مزید کی اور وہ بزرگوار قہقہہ مار کر صدارت کی کرسی پر آ ڈٹے۔ آپ نے کھنکار کر اور ذرا گلا صاف کرکے شاعرانہ انداز میں فرمایا کہ شاعر تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو دریائے خیال میں غوطے مارتے ہیں اور وہ مطلب حاصل کرلاتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو ڈبکی لگا کر سیپی اٹھا لاتے ہیں۔ بعض میں سچے موتی ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض سیپیاں خالی ہوتی ہیں، بعض میں سچے موتی ہوتے ہیں اور بعض میں چھوٹے اور ناکارہ۔ مگر تیسرا وہ ہے جو آنکھیں بند کرکے غوطہ مارتا ہے اور بجائے موتی یا سیپی کے کچھوا پکڑ لاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسی طرح ایک مختصر سی تقریر کی اور وہیں کھڑے کھڑے تمام شعرا کے نام وارنٹ جاری کردیا کہ بغیر کسی چھل حجت کے اجلاس پر حاضر ہوکر بلا تامل اپنا اپنا کلام سنانا شروع کردیں۔ مصرع طرح تھا۔

"صبا نہ ڈھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے"

پورا ہال بجلی کی روشنی سے جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ قدم قدم پر بجلی کے قمقمے روشن تھے مگر چند روشن دماغ شعرا بجلی کی روشنی میں غزل سنانا اپنی توہین سمجھے اور شمع کا مطالبہ کیا پھر کیا تھا ہر طرف شمع شمع کی آوازیں آنے لگیں کہ استنے میں وہ صورت دکھائی دی جس کے کئی لوگ مشتاق تھے۔ یعنی ایک صاحب شعلہ رُو، آتشیں رُخ نہایت خوش وضع اور خوبصورت شمع ہاتھ میں لیے جلوہ افروز ہوئے۔ آوازیں آئیں وہ آگئے شمع محفل۔ اس وقت شعرا ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے اور غزلیں مینڈک کی طرح ان کی جیبوں میں اُچک رہی تھیں۔ چنانچہ ایک سوختہ دِل اور روشن دماغ شاعر تو آؤ دیکھا نہ تاؤ پرواہ وار اُڑا اور شمع پر جا بیٹھا۔ شمع سر نیاز زمین پر رکھ کر شاعر صاحب کے قدم چومنے والی ہی تھی کہ میر محلس کے رُعب و داب سے پھر سرو قامت استادہ ہوگئی اور شمع ان کی قدم بوسی کو جھکی مگر صدر کے رُعب و داب سے پھر ہاتھ باندھ کر اپنے مقام پر ادب سے جا بیٹھی۔

وہاں کئی شاعر تھے اور وہ سب کے سب مُشاق اور فنِ شاعری میں طاق تھے مگر جن شاعروں کے شعر مجھے یاد ہیں میں صرف ان کا ہی ذکر کرتا ہوں۔ سب سے پہلے ایک شاعر صاحب تشریف لائے، آزار بند لٹکتا ہوا، مٹکا سی توند آگے نکلی ہوئی۔ ستوں کی طرح اونچی شیروانی زیب تن کیے اور شہنشاہ ناچار کی سی سر پر ٹیڑھی ٹوپی لگائے موٹے مکھنا ہاتھی کی طرح جھومتے ہوئے شمع کے

سامنے آئے۔ پہلے توند پر ہاتھ پھیرا۔ پھر خدا معلوم آگے یا پیچھے کہاں ہاتھ ڈال کر ایک غزل نکالی اور بڑے مزے سے ہکلا ہکلا کر پڑھنے لگے۔

خزاں بدوش ہے ڈھلتے ہوئے شباب کا رنگ — کچھ ایسے وقت میں الطاف کی نظر ہو جائے

اُڑانے والے مگر فاختہ کے ہوں صاحب — قلم ہوں ہاتھ اگر پانوں کو خبر ہو جائے

ہے نیند اس کا دماغ اس کی رات اس کی ہے — نثار جس پہ کہ مسجد کا مانیٹر ہو جائے

نہیں کہ شرکت لنچ و ڈنر کے ہم قائل — رسوخ کم سے کم اتنا تو ہو کہ سر ہو جائے

اس کے بعد ایک صاحب فوجی لباس پہنے لفٹ رائٹ کرتے ہوئے تشریف لائے۔ اُن کے چہرے پر خوش مذاقی کی جھریاں تھیں اور سامنے کے دو دانت مدت ہوئی وظیفہ پر علٰحدہ ہو چکے تھے۔ اگر معمولی طریقہ سے غزل پڑھتے تو "شاید قافیہ سے آگے بردیف پھسل کر نکل جاتی اس لیے گا کر پڑھنے لگے۔ جگہ جگہ الاپ بھی لیتے ننھے کٹکری بھی لیتے تھے۔ کبھی سُر پہ آتے تو آگے بیٹھے ہوئے شاعر کی پشت کو طبلہ بنا کر تال دینے لگتے بلکہ جوش میں آ کر کبھی کبھار پوری گت بھی بجا جاتے تھے۔ اُن کی شاعری فوجی قسم کی تھی جو قافیہ ملا فوراً رنگروٹوں کی طرح بھرتی کر کے غزل میں شریک کر لیا۔ بڑے مزیدار غزل تھی دو چار شعر آپ بھی سُنیئے۔

کہا یہ اس نے ہمیں اگر شکر ہو جائے — کہا یہ میں نے کرفی الفور ہی ڈنر ہو جائے

نقاب اٹھا کے برابر سے لیٹے صاحب — شبِ وصال کی کیا جانے کب سحر ہو جائے

ترکام میں کہیں کچلہ اگر تجھے دیدے — رقابت اپنی مُسلم یہ ڈاکٹر ہو جائے

اس کے بعد ایک اور بزرگوار تیزی سے اٹھے۔ بانس سا قد، طماق سا چہرہ بھبھے ہوئے کریلے کی طرح منہ پر چیچک کے داغ، سر چھلا ہوا کیرد، چہرے پر جھاج کی طرح ڈاڑھی معلوم ہوتا تھا کہ مذاقاً مارنے کھدڑ کی مصنوعی داڑھی مونچھ لگا لی ہے۔ سر سے پاؤں تک سفید پوشاک زیب تن کئے ہوئے لمبی لمبی ڈگیں بھرتے ہوئے اس طرح آئے جیسے بگلہ خراماں خراماں چلا آرہا ہے۔ عین وسط میں جلوہ افروز ہوئے ایک آنکھ پہلے سے چوپٹ تھی مگر ازراہِ ظرافت دوسری آنکھ مار کر اپنے ہمچشموں سے داد کے طالب ہوئے۔ فرمایا

لگا کے دم جو چلم کا ابھی ہیں فوکردوں ۔۔۔ تو ایک دم میں دھواں دھار بحر و بر ہو جائے

برائی کرنے سے ڈرتا نہیں خدا سے کبھی ۔۔۔ مگر یہ ڈر ہے نہ کتوال کو خبر ہو جائے

اب چوتھے شاعر کی کیفیت سنیئے۔ خوش رو، خوش فکر، خوش سخن اور خوش لباس تھے۔ سر سے پاؤں تک سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ ہنس مکھ ایسے کہ ان کے چہرے کی جھرّیاں ہمیشہ مسکراتی رہتی تھیں اور بات بات پر دانت باہر نکل آئے تھے۔ تھے بڑی عمر کے مگر طبیعت جوان تھی۔ ڈاڑھی آئینے کی طرح صاف تھی مونچھوں کا بالائی حصہ خضاب سے کالا تھا مگر بقیہ سفید حصہ سیاہ بالوں کے نیچے سے عمر رفتہ کو جھانکتا رہتا تھا۔ بڑے ٹھسّے سے اٹھے، بڑے ٹھسّے سے بیٹھے، پہلے مونچھوں کو تاؤ دیا پھر کالر کے ہک کھول کر جیب سے غزل نکالی اور کوئل کی طرح کوکنے لگے۔ آپ بھی دو چار شعر سن ڈالیے۔

اسی طرح سے جو ہر سال اک ڈنر ہو جائے ۔۔۔ تو یہ مکان بھی رندوں کا مستقر ہو جائے

بڑے نصیب ہیں اس کے جو ڈاکٹر ہو جائے ؛ مرا تو اس کی قضا، نہ مرا تو ان کی دوا اسے

پولیس کو آپ کے دھندوں کی گر خبر ہو جائے ؛ ہوائیں کھائیں گے حضرت بھی جیل خانہ کی

تو یہ سزا ہے کہ کانوں میں اس کا سر ہو جائے ؛ جو ہم سے پاک ستاروں کو مسخرہ سمجھے

اس کے بعد ایک اور صاحب اٹھے۔ منہ پچکا، آنکھیں بد رونق، منہ پر جیتے ہوئے کھیت کی طرح جھریاں، آدھے دانت ذاتی اور آدھے صفاتی، بات بات پر ظرافت کو منہ چڑاتے تھے اور بات بات پر چھٹے کی طرح ان کے دانت باہر نکل آتے تھے۔ اپنی غزل ہاتھ میں لے کر اس طرح جا بیٹھے جیسے چینی یا جاپانی نمک چھڑک کر کاغذ کھائے۔ انہوں نے اپنی غزل چاب چاب کر پڑھنا شروع کر دی۔

جنم میں دوسرے شاید وہی مگر ہو جائے ؛ تو سو کبھی مچھلی سے بھی درکہ بحر دن میں

یہ کریں جو کچھ دن کو ڈاکٹر ہو جائے ؛ یقین مانو زمین سو روپے کی دو گز ہو

سر اتنا پھولے خوشی سے سری نگر ہو جائے ؛ کبھی وہ چاند جو سر پر مرے رسید کرے

شعر و سخن کا ہنگامہ زور پکڑتا چلا جا رہا تھا۔ شاعر شعر پڑھ پڑھ کر سلام پر سلام مار رہے تھے اور حاضرین والا پوری قوت سے چیخ دپکار کے نعرہ ہائے تحسین بلند کر رہے تھے۔ مشاعرہ ختم ہونے کی بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ ہر ادلڑ بوائے خم ٹھوک کر میدانِ سخن میں کود پڑا تھا اور ہر اپنی اپنی گاؤ زوریاں اور داؤں پیچ بتانے میں مصروف تھا گھنٹے کی سوئیاں چکر کھاتے کھاتے عجلّی کھا گئیں۔ جب ہم گھر پہنچے تو مرغا اذاں دے رہا تھا ▲ ▲

بھانڈوں کی کہانی
بھانڈوں کی زبانی

اگلے زمانے میں بھانڈوں کا طوطی بولتا تھا۔ شادی ہو یا بیاہ ختنہ ہو یا بسم اللہ ان کی موجودگی ضروری تھی۔ مثل مشہور ہے سُونی ہے وہ محفل کہ جہاں بھانڈ نہ باشد۔ جہاں یہ نہ ہوتے وہاں اُداسی پڑ جاتی اور جس محفل میں یہ قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے تو بس سمجھ لو کہ ایک دیوار قہقہہ کھڑی ہو گئی۔ ان میں لکھے پڑھے، کوری اور لکھیت، بے علم اور جاہل سب طرح کے تھے۔ مگر حاضر جوابی۔ خوش مذاقی اور لطیفہ گوئی میں تو سب کے سب طاق تھے۔ اس کے علاوہ ایک کمال ان میں یہ تھا کہ جس کو نظر بھر کے دیکھتے اس کا ایسا رنگ اُڑاتے کہ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ ان میں کریلا، سجن، دل پسند اور اچپل وغیرہ کے طائفے بہت مشہور تھے۔

دہلی کا کریلا بھانڈ محمد شاہ کے زمانے میں تھا۔ ایک مرتبہ اس کی کسی بات پر بادشاہ نے ناراض ہو کر حکم دیا کہ سب بھانڈوں کو ملک سے نکال دیا جائے۔ دوسرے روز بادشاہ کی سواری نکلی تو دیر سے گانے بجانے

کی آوازیں سنائی دیں ۔ بادشاہ نے تعجب سے سر اٹھا کر ملاحظہ فرمایا تو دیکھا کہ کریلا بھانڈ طائفہ کے ساتھ ڈھول بجا بجا کر گا رہا ہے ۔ سواری رکوا کر پوچھا کہ یہ کیا گستاخی ہے اور ہمارے حکم کی تعمیل اب تک کیوں نہیں ہوئی ۔ عرض کی کہ قبلہ عالم ساری دنیا تو جہاں پناہ کے زیر نگیں ہے، جائیں تو کہاں ۔ اس لیے عالم بالا کا ارادہ کیا اور یہ پہلی منزل ہے ۔ اور جواب پر بادشاہ ہنس پڑا اور ان کا قصور معاف کر دیا ۔

ایک اور قصہ ہے کہ کسی رئیس نے بھانڈوں کو ایک قیمتی دوشالہ انعام میں دیا مگر وہ ذرا بوسیدہ تھا ۔ ایک بھانڈ نے اسے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا ۔ دوسرے نے پوچھا میاں کیا دیکھ رہے ہو؟ اس نے کہا یہ دیکھتا ہوں کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے ۔ پوچھا آخر کیا لکھا ہے ۔ اس نے عینک لگائی اور اٹک اٹک کر پڑھا ۔ لا الٰہ اللہ ۔ دوسرے نے کہا بس اتنا ہی کیا آگے محمد رسول اللہ نہیں لکھا جواب دیا کہ محمد رسول اللہ کیسے ہو یہ تو ہمارے آنحضرت سے پہلے کا ہے ۔

غرض ایسے بیسیوں لطیفے ہیں جو بھری مجلس میں یہ لوگ برجستہ کہہ جاتے تھے ۔ ان کی لچھے دار گفتگو اور رنگین عبارتیں سننے کے قابل ہیں ۔ نمونہ کے طور پر ایک افیونی کی نقل لکھتا ہوں آپ بھی پڑھیں اور لطف اٹھائیں ۔

راویاں اخبار و ناقدانِ آثار ایک افیونی کا بیان زبان فیض ترجمان سے اس طرح پر کرتے ہیں کہ ڈبیا افیون کی کھول، کانٹے میں تول، پانی میں گھول جو پیتے ہیں تو آنکھوں کو میچ، حقّے کو کھینچ، پینک کے بیچ ہو کر کیچڑ میں جا لیٹے ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شہر ہے، شکرآباد اس کا نام ہے کھوٹے کی شہر پناہ در بہشت کی چوکھٹ، برفی کی دیوار، نوادرات کا فرش، تلشکری کا دریا،

جلیبی کا پھاٹک، بتاسے کی کنڈی، قند کے کنگورے، سویوں کی جھاڑیاں
دودھ کا دریا، شربت کی نہر، شکر ندی کا ریتا۔ حلوے کی دلدل، کھاجوں کے
پہاڑ شکرپاروں کے روڑے کہیں کم اور کہیں تھوڑے، جا بجا ڈھیر لگے ہیں۔ مالک
اُس شہر کی شاخ نبات شہزادی جس کے دربار میں چیونٹیوں کے سواء، مکھیوں کی
فوج بھڑوں کے افسر ہر دم کمر باندھے طلایہ گردی میں مصروف رہتے تھے۔

افیونی اس تماشے کی فضا اور مٹھائی کا مزہ زبانِ عندلیب بیان پر تصدق
کرکے، کالی افیون کا مشکی بتا کے۔ ملائی کا زین کس کے، بتاسے کی رکاب بڑھیا
کے کاتے کی لگام۔ بتاس پھینی کی رچی، حقے کا کوڑا، گنے کا برچھا، ریوڑی کی
ڈھال، تل شکری کی تلوار باندھ کر فوج ظفر موج کو ساتھ لے کر، سوار ہوا اور
مشکی کو جولاں کرتا ہوا حلوے کی دلالی سے نکلا، شہد کی کھائی کے اُس پار کود،
شکرپارے اور ریوڑیوں کی ٹھوکریں کھاتا ہوا قریب شہر شکر آباد کے جا پہنچا۔

اس عرصہ میں لڑائی شروع ہو گئی اور افیونی بھی معہ فوج، شاخ نبات
بادشاہ زادی کے دروازے پر جا پہنچا۔ بادشاہ زادی ناریل کی گری کے سیردے۔
سیویوں کے باندھوں سے بنا ہوا پلنگ، چھواروں کے پائے، حلوے کے قالین
پستوں کے تکیے گرد و پیش لگائے، انار دانوں کی جھالریں اور اوس کے پردے
ڈالے ہوئے بیٹھی تھی۔ سنتے ہی اس خبر وحشت اثر کو کہ افیونی واسطے جنگ و جدال
بکے آیا ہے۔ مستعد ہو کر، باجرے کے بالوں کے بھالے لئے ہوئے، شکر بیگ و
اللہ خان و ارود خان، وجامن والے وفالسہ والے، و بڑھل سنگھ وکٹھل سنگھ،

دشنم بابو دشیخ سنبھالو کے اردلی خاص میں جلوہ کرتی جاتی تھی کہ اسے جنو بیو، دلور بیو، دتورانیو دایرانیو، انگریزو، دلندیزو، چینیوں، ماچینیوں، ہندستانیو ترکستانیو، پکڑنا، لینا، جانے نہ دینا اور اقبوتبوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی جانا۔

دوپہر تک تو اسی طرح لڑائی رہی کہ تندوشکر کی بارات، کنول گٹوں کے کارتوس ٹکیوں کے چھرے اور لڈوں کے گولے مارتے دائیں دائیں کرتے چلے آتے تھے۔ توپ بندوق سے، چھرے باروت سے شاخ نبات بادشاہ زادی پر کڑی بوچھاڑ برسا کے دوپہر کے بعد دھاوا کیا اور سب کو بھگا دیا اور شاخ نبات شہزادی کو پکڑ لیا۔ آنکھ کھل گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ کیچڑ میں پڑے ہیں، کتا منہ چاٹتا ہے اور ــــــ مکھیاں اڑا اڑا کر منہ میں آ رہی ہیں۔ کہنے لگے کہ اکثر کیچڑ میں پڑے رہے مگر یہ مزہ کبھی حاصل نہیں ہوا۔

بہر حال یہ ایک ایسے منظر کا مختصر سا بیان ہے جو ہمارے ملک کے علاوہ دنیا کے کسی اور حصے میں ہوتا تو نہ صرف اس کو درسی کتابوں میں جگہ ملتی بلکہ اس کے اشتہاروں سے در و دیوار چھپ جاتے اور ہر گھر میں اس کو تصویریں لگی ہوئی دکھائی دیتیں۔

▲▲

مُلّا دوپیازہ

مثل مشہور ہے کہ دو مُلّاؤں میں مُرغی حرام۔ یہ مثل مُلّا صاحب پر ایسی چپکتی ہے جیسے گوندسے کاغذ۔ آپ اکبر کے زمانے کی کوئی تاریخ اُلٹ پلٹ کر دیکھ لو۔ مختلف ناموں کے مُلّا دستارِ فضیلت باندھے نظر آئیں گے مگر نہیں دکھائی دیں گے تو ملا دوپیازہ۔ دنیا میں بیسوں ظریف ہیں۔ ہر ایک کے حالات کسی نہ کسی کتاب میں مل جاتے ہیں مگر ستم ظریفی دیکھئے اگر حالات نہیں ملتے تو مُلّا دوپیازہ کے۔ پھر خود مُلّا صاحب کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں۔ آفتاب عالمگیری' لغت ترکی' فارسی لطائف' النامہ' مُلّا نامہ' یار لوگ پڑھتے ہیں اور ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں۔ مُلّا صاحب کی تصویر بھی کئی کتابوں میں موجود ہے۔ ایک تصویر دوسری تصویر سے ملتی جلتی بھی ہے۔ وہی گدھا' وہی ڈیل ڈول' وہی توند' وہی ناک آنکھ مگر افسوس یہ ہے کہ نہ تو کسی تاریخ میں آپ کا نام ہے اور نہ کسی کی کتاب میں آپ کا بیان ہے۔ ہاں غائبانہ یار لوگ ان کے لطیفوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جدھر دیکھو لطیفوں کی دھوم ہے' نام دُنیا بھر میں شیطان کی طرح مشہور ہے مگر وجود عنقا کی طرح معدوم ہے۔

مگر ہم نے ان کے متعلق جو لکھا ہے اس پر کافی سے زیادہ اعتماد اور بھروسہ ہے۔ اس لیے کہ پہلے تو ہم نے خود مُلاّ دوپیازہ کے فالنامہ سے روحانی امداد حاصل کی اور ان کے ہدایات کے بموجب قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے، دو چار بار لاحول پڑھ کے، بغیر وضو کئے دائیں ہاتھ کی چھنگلیا اُس کے خانہ پر رکھ کر نام ونشان اور خاندان کا پتہ چلایا اور دوسرے تمام غیر مستند اور غیر معتبر زاویوں کی ضعیف روایتیں جمع کی ہیں۔ اور ایسے ایسے محققین کی کتابوں سے واقعات چُنے ہیں جو عُمر بھر تحقیق کرنے کے بعد بھی معاملہ خدا پر چھوڑ دیتے تھے۔ مثلاً ایک مشہور ومعروف محقق شہر بابئی جان کے متعلق فرمایا ہے کہ "شہریست مشہور ومعروف بعضے گویند کہ در مشرق و بعضے در مغرب الخ واللہ اعلم بالصواب۔"

اب مُلاّ دوپیازہ کوئی بھی ہوں مگر تھے ظریفوں کے بادشاہ اور مسخروں کے شہنشاہ۔ جہاں جاتے محفل کو کشت زعفران بنا دیتے، اور لوگوں کو ہنساتے ہنساتے رُلا دیتے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ مُلاّ صاحب کا نام ابوالحسن تھا، کوئی کہتا ہے کہ مُلاّ مومن تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ کوئی کہتا ہے کہ متھرا میں جنم لیا۔ کوئی انہیں ایرانی کہتا ہے تو کوئی تورانی۔ کہیں کے ہوں مگر تھے، ہندی ثم ہندی۔ یہیں پیدا ہوئے اور یہیں مرے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کا نام مُلاّ دوپیازہ کیسے ہو گیا۔ تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک دن فیضی نے انہیں دعوت دی۔ دسترخوان پر دوپیازہ آیا، وہ مُلاّ صاحب کو بہت بھایا۔ فیضی بھی ظرافت کا پتلا تھا۔ ممکن ہے کہ پہلے ہی کھچڑی پکا کے رکھی ہو! فوراً اُن کا نام مُلاّ دوپیازہ رکھ دیا۔ یہ نام چلا اور

ایسا چلا کہ یار لوگ اصلی نام بھول گئے اور مُلّا صاحب، مُلّا دوپیازہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

ظرافت اور بذلہ سنجی مُلّا صاحب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ بچپن سے آفت کے پرکالہ تھے۔ مکتب میں گئے تو آپ کے استاد کانے تھے۔ استاد نے کہا، پڑھو الف خالی، ب کے نیچے ایک نقطہ اور ت کے اوپر دو نقطے۔ تو صاحبزادے بلند اقبال نے پڑھا ب کے نیچے دو نقطے اور ت کے اوپر چار نقطے۔ استاد نے کہا، نامعقول میں ایک اور دو نقطے کہتا ہوں اور تو دو اور چار کہتا ہے۔ مُلّا صاحب نے فرمایا، استاد صاحب! آپ تو ایک آنکھ سے دیکھ کر ایک اور دو نقطے کہتے ہیں۔ مجھے خدا نے دو آنکھیں دی ہیں اس سے دو اور چار کہتا ہوں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ دوپہر کے وقت چھٹی ہوئی۔ لڑکے کھانا کھانے چل دیئے۔ حضرت کو شرارت سوجھی ایک لڑکے جزدان سے ایک کتاب نکال استاد کے جزدان میں چھپا دی اور خود رفوچکر ہو گئے۔ اب لمڈے واپس آئے تو فوری مقدمہ استاد کے سامنے پیش ہوا۔ استاد تھے تو کانے مگر غصے میں اندھے بن جاتے تھے۔ فرمایا، بستوں کا جائزہ لو۔ جس کے بستے سے نکلے اس کا منہ کالا کر دو اور الٹے کان پکڑوا کر تسمہ لگاؤ۔ کیا تھا ادھر تلاشی شروع ہوئی اور ادھر مُلّا صاحب نے چور کا منہ کالا کرنے کے لئے سیاہی اور تیل کا بندوبست فرمایا اور تسمہ لا کر سامنے رکھ دیا۔ تلاشی ہوئی مگر کتاب کہیں نہیں ملی تو

مُلّا صاحب نے کہا کہ تبرکاً و تیمناً اب استاد صاحب کے جزدان کے بھی درشن کر لئے جائیں۔ استاد کا جزدان کھولا تو اس میں کتاب موجود تھی۔ مُلّا صاحب سیاہی ہاتھ میں لے کر دست بستہ کھڑے ہو گئے کہ اب حکم کی دیر ہے۔ اور یہ روسیاہ تعمیل حکم کے لئے حاضر ہے۔

غیر مستند و غیر معتبر مثل مشہور ہے کہ گرگٹ کی دوڑ باگر تک اور مُلّا کی دوڑ مسجد تک۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو مُلّا صاحب جامع مسجد کے پیش امام ہو گئے مگر ظرافتِ طبع نے مسجد سے نکال کر اکبر کے دربار میں پہنچا دیا۔ اب کیا تھا روزہ نماز تو ایک طرف رہا رات دن ظرافت اور خوش مذاقی کی آتشبازی چھوٹتی رہتی تھی اور بادشاہ اور اہلِ دربار لطف اٹھاتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ راجہ بیربر نے کہا، جس کے نام کے آگے "بان" ہوتا ہے اُس سے ہمیشہ بچتے رہو۔ مثلاً فیلبان، کشتی بان، شتربان وغیرہ یہ سب کے سب بڑے حرامزادے اور بدمعاش ہوتے ہیں۔ مُلّا صاحب نے دست بستہ عرض کی کہ سچ کہتے ہو "مہربان"۔

ایک مرتبہ اکبر بادشاہ حوض کے کنارے بیٹھا تھا۔ سب نے مِل کر مُلّا صاحب کو اُلّو بنانے کی اسکیم تیار کی۔ بادشاہ نے انڈے منگائے اور درباریوں کو بانٹ کر فرمایا کہ ہر ایک اپنا اپنا انڈا حوض میں چھپا دے۔ اور غوطہ مار کر ڈھونڈ لائے۔ سب نے اپنے اپنے انڈے حوض میں چھپا دیئے۔ اتنے میں مُلّا صاحب بھی تشریف لے آئے۔ اور وہ بھی ان میں کھڑے ہو گئے۔ اکبر بادشاہ

نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ اس حوض میں انڈے ہیں، جو درباری واقعی میرے وفادار ہیں انہیں وہ مل جائیں گے اور وہ غوطہ مار کر نکال لائیں گے۔ اب کیا تھا ہر ایک غوطہ مارتا اور اپنا انڈا نکال لاتا۔ تھوڑی دیر میں مُلا صاحب کی باری آئی۔ مُلا صاحب درباریوں کی شرارت بھری نظروں سے معاملہ تاڑ گئے فوراً حوض میں جست کی اور پانی میں کھڑے ہو کر اپنا سینہ پُھلا کر، دونوں بازو پسلیوں پر پھڑ پھڑائے۔ اور زور سے بانگ دی۔ ککڑوں کوں، ککڑوں کوں۔ بادشاہ نے کہا کیا ہوا تمہارا انڈا کہاں ہے؟ مُلا صاحب نے جواب دیا، حضور مجھ سے انڈے کی امید مت رکھئے! یہ سب مرغیاں ہیں جو انڈا لے آئیں میں تو مُرغ ہوں!

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مرزا عزیز کو کرنے ایک پُر تکلف محل بنوایا۔ اس تقریب میں یار دوستوں کو دعوت دی اور مُلا دوپیازہ اور بیربر کو بھی مدعو کیا۔ تمام لوگوں نے تعریف کے پُل باندھے۔ بیربر نے کہا، جناب مکان تو واقعی بہت اچھا ہے مگر اس کے دروازے اس قدر تنگ ہیں کہ اس میں سے مُردے کی چارپائی بھی نکلنا مشکل ہے۔ مرزا یہ بدشگون سُن کر کبیدہ ہوئے اور اس کی شکایت مُلا دوپیازہ سے کی۔ مُلا نے کہا، اجی! وہ جھوٹ بکتا ہے میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ آپ کا سارا خاندان بھی مر جائے تو دروازہ تو رہا ایک طرف اس کھڑکی سے نکل جائے۔

ایک روز اکبر بادشاہ، راجہ بیربر اور مُلا دوپیازہ باغ میں چہل قدمی

فرمارہے تھے۔ اکبر نے اپنی قبا اُتار کر مُلّا صاحب کے کاندھے پر دھر دی۔ بیگم کر بیربر نے بھی اپنی قبا اس کے کاندھے پر رکھ دی اور از راہِ مذاق کہا کہ مُلّا صاحب! اب تو آپ پر پورا ایک گدھے کا بوجھ ہوگیا ہے!

مُلّا صاحب نے فوراً جواب دیا "ابھی قبلہ ایک گدھے کا کیا، اب تو دو گدھوں کا بوجھ ہے!

اب مُلّا صاحب کا ایک دلچسپ مناظرہ بھی سُن لیجئے۔ ایک شامت زدہ مولوی ایران سے ہندوستان تشریف لائے۔ مُلّا دو پیازہ کی تعریف سُنی تو اُن سے خاموش مناظرہ یعنی علم اشارہ سے بحث کرنے کی ٹھہرائی۔ مُلّا صاحب کب جُھکنے والے تھے۔ فوراً منظور کر لیا۔ اینٹ بنانے والوں کو حکم دیا کہ دو بڑی بڑی لمبی چوڑی اینٹیں تیار کریں۔ جب اینٹیں تیار ہوگئیں تو جولاہے بُلائے گئے اور کھادی کے جزدان سلوائے گئے۔ ایک کتاب پر موٹے قلم سے تحریر فرمایا "مجموعہ خشت البحر" اور دوسری پر "کتاب مستطاب اینٹا ثرادہ" اور یہ دونوں کتابیں بڑے اہتمام اور انتظام سے مقامِ مناظرہ پر روانہ کی گئیں۔ ہر طرف دھوم مچ گئی کہ مُلّا صاحب نے مناظرہ کے لئے اپنی دو کتابیں چھکڑوں پر لاد کر بھیجی ہیں۔ ہر طرف سے یہ لوگ تماشا دیکھنے وہ مولوی اپنے خیمہ سے باہر نکل آیا اور کتابوں کی عظمت اور حجم دیکھ کر بہت سٹ پٹایا۔

خدا خدا کر کے مناظرہ کا دن آیا۔ مُلّا صاحب تشریف لائے۔ سر پر کئی تھانوں کا عمامہ بندھا تھا اور طول طویل شملہ بمقدار علم چھٹا ہوا تھا۔ دونوں جلد

پر جلوہ افروز ہوئے۔ مجمع کی یہ کیفیت کہ جوتا پھینکو تو سر پر پڑے اور نیچے نہ گرے۔ نہایت خاموشی کے ساتھ اشاروں میں مناظرہ شروع ہوا۔ پہلے مولوی صاحب نے ایک انگلی نکالی کھڑی کردی۔ مُلّا نے دو انگلیاں بطور مثلث زدشاقین استادہ فرمادیں۔ مولوی نے پھر تین انگلیاں بتائیں تو مُلّا نے چار دکھا دیں۔ اس نے پانچوں انگلیاں اکٹھی کر کے بتائیں تو مُلّا نے فوراً مٹھی بند کر کے اس طرح بتایا جیسے کہ کوئی گھونسا تانتا ہے۔

پھر تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد مولوی نے ایک انڈا جیب سے نکال کر سامنے رکھ دیا، اسے دیکھ کر مُلّا دو پیازہ نے فوراً ایک پیاز کی ڈلی اپنی جیب سے نکال کر انڈے کے سامنے ڈال دی۔ اس کے بعد مولوی صاحب آگے بڑھے اور ایک کتاب اٹھا لائے تو مُلّا صاحب نے اپنی کتابیں حاضر کرنے کا حکم دیا۔ اللہ توبہ! ایک کتاب اٹھانے کے لیے جرثقیل کی ضرورت پڑی۔ پچاس ساٹھ مزدور زور لگا کر ایک کتاب لائے تو غریب مولوی کی پوری کتابیں ایک جلد کے اندر دب کر رہ گئیں اور صرف اینٹ الشرادہ نے پورے خیمہ کی وسعت پر قبضہ جمالیا۔ اتنی لمبی چوڑی اور بھاری بھرکم کتابیں مولوی صاحب کے باپ نے کبھی نہیں دیکھی تھیں، خیمہ سے گھبرا کر باہر نکلا۔ مُلّا دو پیازہ نے تالی پیٹی، لولو ہے لولو ہے۔ اب کیا تھا چاروں طرف سے تالیاں پٹ گئیں۔ اور بیچارہ مولوی جو سٹ پٹایا تو دُم دبا کر ایسا بھاگا جیسے لاحول سے شیطان۔ یہ خبر سارے شہر میں گشت کر گئی۔ اکبر نے مُلّا دو پیازہ کو بُلا کر بحث کی کیفیت پوچھی

تو پہلے مُلّا صاحب نے اینٹ البحر اور اینٹ الیزادہ کی تشریح کی۔ اور فرمایا کہ مولوی نے چھوٹتے ہی مجھے ایک انگلی بتائی۔ تو میں سمجھا کہ یہ مردود کہتا ہے کہ تیری ایک آنکھ پھوڑ دوں گا۔ اس لئے میں نے اُسے دو انگلیاں بتا کر متنبہ کیا کہ بیٹا تو میری ایک آنکھ پھوڑے میں تیری دونوں پھوڑ ڈالوں گا۔ پھر اس نے تین انگلیاں بتا کر مجھے دھمکایا کہ مجھ سے زیادہ تین پانچ نہ کر اور ہار مان لے۔ تو میں نے چار انگلیاں دکھا کر یہ ظاہر کیا کہ میں تجھے چاروں شانے چت کر ڈالوں گا۔ اس نے پھر پانچوں انگلیوں سے تھپڑ بتایا تو میں نے اس کے جواب میں گھونسا بتایا۔ اس کے بعد اس نے ایک انڈا پیش کیا تو میں نے پیاز بڑھا کر اس کا لوازمہ بتایا کہ دیکھ میں اس کا خاگینہ بنا کر چٹ کر جاؤں گا۔

اس کے بعد جب اس نے اینٹ الشزادہ اور خشت البحر دیکھی تو اس کی سنگینی اور ثقل سے مولوی صاحب کی آنکھیں پتھرا گئیں اور مقام مناظرہ سے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مُلّا صاحب نمک مرچ لگا کر مناظرہ کے حالات بیان کر رہے تھے بادشاہ چٹخارے لے رہا تھا۔ اہلِ دربار پیٹ پکڑے بے تحاشا ہنس رہے تھے۔

اب اُدھر ایرانی مولوی صاحب کا حال سُنئے، اکبر نے مُلّا صاحب کی عدم موجودگی میں بحث کے حالات پوچھے تو اُس نے پہلے تو مُلّا دوپیازہ کے مطالعہ کی وسعت علمی قابلیت اور زر تصنیف کتاب کی طوالت کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ میں نے "وحدت الوجود" کے مسئلہ پر دوستی ڈالی اور ایک

انگلی بتا کر کہا کہ خدا ایک ہے تو انہوں نے تثلیث ایمان کے مدنظر دو انگلیاں بتا کر رسول اللہ کے وجود کو ثابت کیا۔ میں نے تین بتا کر اصحاب ثلاثہ کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے چار بتا کر خلافت راشدہ کی طرف توجہ دلائی۔ پھر میں نے پانچ انگلیاں پنجتن کا خیال جمایا تو انہوں نے گھونسہ بتا کر آگاہ کیا کہ خدا سب پر حاوی ہے۔

"علم الکلام" کی بحث ختم ہونے کے بعد میں نے "علم ہئیت" کی بحث چھیڑی اور جیب سے انڈا نکال کر بتایا کہ ہمارا کرہ اور اس کا مدار بیضوی ہے۔ وہ فوراً تاڑ گیا اور جیب سے پیاز نکال کر اشارا کیا کہ کرۂ زمین میں پیاز کے چھلکوں کی طرح طبقات بھی ہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ اس سے منقولی بحث کرنی چاہئے اور کسی فقہ کے مسئلہ کو دیکھ کر لینا چاہیئے مگر ملا صاحب کی تصانیف اینٹ الپٹرادہ اور خشت البحر دیکھ کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور میں نے ہار مان لی۔ سچ ہے ہر کس بخیال خوش خبطے دارد۔

ملا صاحب کو دعویٰ تھا کہ میں دور سے آدمی کی صورت دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ وہ عقلمند ہے یا بیوقوف۔ ایک دن بادشاہ نے ملا صاحب کو حکم دیا کہ وہ بے وقوفوں کی فہرست تیار کر کے پیش کریں۔ انہوں نے فوراً چند نام لکھ کر پیش کر دئے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ فہرست میں سب سے پہلا نام بادشاہ سلامت کا ہے۔ وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ فلاں تاریخ کو آپ نے ایک لاکھ روپے سوداگروں کو بغیر سوچے سمجھے دیدیا کہ وہ یمن سے آپ کے لئے گھوڑے لائیں۔ اب مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو گھوڑا تو کیا گھوڑے کی دم بھی لا کر

نہیں دینگے ۔ بادشاہ نے کہا اگر وہ حسبِ وعدہ گھوڑے لے آئے تو ؟ مُلّا صاحب نے فرمایا کہ اگر گھوڑے لے آئے تو پھر آپ کا نام کاٹ کر میں اُن کا نام لکھ دوں گا۔ کسی کا شعر ہے ؎ چچا کے بھتیجے تو مشہور ہیں ، بھتیجہ بھی اپنا چچا ہو گیا ۔

قسمت سے مُلّا صاحب کو شاگرد بھی ایسا ملا جو شوخی اور شرارت میں استاد کے بھی کان کاٹتا تھا ۔ ایک دن مُلّا صاحب سے کہنے لگا کہ حضور ! غزل کہنے کو طبیعت چاہتی ہے ۔ اگر کوئی مصرعہ عنایت ہو تو طبع آزمائی کردوں ۔ مُلّا صاحب نے ازراہِ مہربانی یہ مصرع دیا " شاہا چہ عجب گر بنوازند گدارا " سعادت مند شاگرد نے یہ اشعار لکھے ۔

استاد کو میدان میں آج ہم نے پچھاڑا ؛ چھاتی پہ چڑھے کود کے داڑھی کو اکھاڑا

استاد کے مصرع پہ لگاتے ہیں گرہ ہم ؛ شاعر ہمیں کر دیجئے یا شاہ بخارا

یہ طرفہ غزل ہم نے کہی مولوی صاحب ؛ اصلاح سے دل کیجئے خورسند ہمارا

پہلی ہی غزل پر ہیں ہوئے داد کا خواہاں ؛ شاہا چہ عجب گر بنوازند گدارا !

مُلّا صاحب غزل سُن کر بہت جُز بُز ہوئے ۔ غصہ کو ضبط کیا اور فرمایا ، غزل اچھی اور خوب کہی اصلاح کی ضرورت نہیں ۔ ہاں ایک شعر کی کمی ہے وہ ہم لکھ دیتے ہیں ۔ اور یہ شعر بڑھا دیا ۔

یہ طرفہ غزل لائے ہیں استاد کے آگے ؛ صد لعنت و پھٹکار چنیں ذہنِ رسا دا

مُلّا صاحب نے جو النامہ لکھا ہے اُس کے کئی لفظ یار لوگوں کی زبان پر ہیں اور رَو میں بول جاتے ہیں مگر انہیں پتہ نہیں کہ وہ مُلّا صاحب کی عنایت سے

عالمِ وجود میں آئے مثلاً "الانتظار اشد من الموت" ۔ "الخاموشی نیم رضا" ۔ الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی المنشکا کا رمکاراں وغیرہ ۔ آپ نے ٹن ٹرمپٹ اور سائیکس ورڈ بک "EMLEROSE BIEREE & HORACE SMITH" کا مطالعہ کیا ہوگا ۔ اب مُلّا صاحب کے لغت کے چند الفاظ سنئے کس قدر ظرافت میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ خدا کی پناہ ۔

۱	فرشتہ	چغل خفی	۱۳	راست گو	دشمن ہر کس
۲	بادشاہ	کاہلِ زماں	۱۴	کذّاب	در ہر سخن بلند
۳	وزیر	ہرفِ تیر بیچارگاں	۱۵	مرض	پیغامِ اجل
۴	خوشامدی	تازہ روزگار	۱۶	ہلاکت	نتیجہ کدخدائی
۵	وکیل	مجتہدِ روزگار	۱۷	دانشمند	آنکہ عقلِ معاش ندارد
۶	طبیب	پیکِ اجل	۱۸	معلّم	ملک الموتِ اطفال
۷	بیمار	تختۂ مشقِ طبیباں	۱۹	قاضی	رشوت خور
۸	شاعر	متکبر	۲۰	مردود	مہمان بعد از سہ روز
۹	مُلّا	دائم گرسنہ	۲۱	صبر	تکیۂ نامرداں
۱۰	رشوت	دستگیرِ درماندگان	۲۲	ترغیب	مرد بے روزگار
۱۱	مؤذن	خوابِ کاہلاں خلل انداز	۲۳	واعظ	آنکہ بگوید خود نہ کند
۱۲	یار وفادار	روپیہ	۲۴	منجم	کذّاب

خدا معلوم کیا دماغ میں سمائی جو آخر عمر میں سفر کی ٹھہرائی۔ بھوپال کے نزدیک کسی مقام پر پہنچے لوگوں سے پوچھا کہ بھئی اس جگہ کا کیا نام ہے؟ لوگوں نے کہا ہنڈیا۔ کہنے لگے کہ اب دو پیازہ ہنڈیا سے نکل کر کہاں جائے گا۔ کچھ روز وہیں بیمار رہے اور سب کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کا آخری شعر اور سن لیجئے جو مرنے سے پہلے کہا تھا ؎

دو پیازہ اب نکس ہنڈیا میں جائے کے
مکھی کے ہاتھ پھنس گئے جالے میں جائے کے
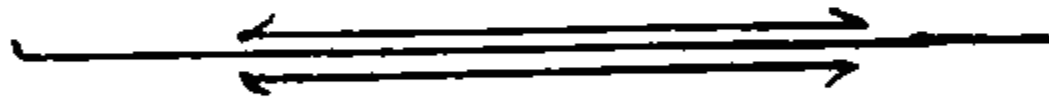
پالش اور مالش

کیا آپ بمبئی گئے ہیں ؟ اگر نہیں گئے تو ایک مرتبہ ضرور جاکر دیکھ لیجئے ۔ وہاں ہزاروں دلچسپ چیزیں ہیں مگر دو چیزوں کا بہت زور ہے۔ ایک تو مالش اور دوسرا پالش ۔ پالش کا تعلق تو پاؤں سے ہے اور مالش کا سر سے ہے ۔ آپ چلتے چلتے کسی سڑک کے کنارے پر کھڑے ہو جائیے ۔ بس فوراً ہی ایک لمڈا پالش کی ڈبیا ہاتھ میں دبائے ٹپک پڑتا ہے اور مسکراتا ہوا جوتے کی طرف دیکھ کر کہتا ہے حضور! پالش ۔ اب آپ گردن ہلاکر آگے بڑھیے اور وہیں کسی بینچ پر ٹِک جائیے بس فوراً ہی دوسرے صاحب نازل ہوجاتے ہیں ۔ ایک ہاتھ میں کنگا، دوسرے ہاتھ میں تیل کی بوتلیں کاندھے پر میلا چکٹ تولیہ، کمر میں رنگین پٹکا، ڈاڑھی موچھیں صفاچٹ اور کنگھی چوٹی سے درست ۔ اِدھر آپ نے اُن کی طرف نظر کی اور اُدھر اُس نے آنکھ مار کر کہا کہ حضور! مالش ۔ پالش کا مطلب تو صاف ہے سمجھ میں آجاتا ہے مگر یہ آنکھ مارنے کا کیا مطلب ہے اجنبی کی سمجھ میں نہیں آتا ۔ اگر کسی نے رحم کھاکر اپنا سر اُن کے حوالے کر دیا تو پھر خیر نہیں ۔ ایسی مالش کرتے ہیں کہ دیکھئے

والے کاجی مالش کرنے لگے ۔ تھوڑا سا سڑا ہوا پھول اور پانی میں ملا ہوا تیل سر میں ڈال کر وہ دبا دبا کے جیبیت رسید کرتا ہے کہ چھینٹے دور دور تک اڑتے ہیں اور وہ وہ رگڑے دیتا ہے کہ سر بھنا جائے اور دماغ خود کانپ آجائے۔

ہم بھی چند روز ہوئے کہ بمبئی گئے تھے ۔ پالش والے نے ہم پر ہاتھ صاف کرنا چاہا، مالش والے نے بہت کچھ روغنِ قاز ملا مگر ہم صاف بچ کر نکل گئے لیکن دور سے اُن دونوں کے کاروبار ضرور دیکھتے رہے ۔ اچھا تو واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن ہمیں لہر آئی اور ہم چہل قدمی کرتے ہوئے چوپاٹی کی طرف نکل گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب چوڑیدار پاجامہ پہنے، زرد رنگ شیروانی ڈانٹے کشتی نما ٹوپی اوڑھے اور پاؤں میں سیاہ بوٹ ڈانٹے بڑے ٹھسّے سے تشریف لائے اور بینچ پر لد گئے ۔ ہم بھانپ گئے کہ یہ شاعر ہیں اور مضمون کی جستجو میں شعر و سخن کے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہے ہیں ۔ اتنے میں ایک لمڈے نے سامنے آکر کہا حضور! پالش ۔ انہوں نے پاؤں آگے کر دیے ۔ اس نے فوراً اُن کے پاؤں سے جوتے اتار ایک طرف بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ بتلانے شروع کر دیے ۔ ہم نے دیکھا کہ اس کی ڈبی میں پالش مطلق نہیں تھا مگر واہ رے کاری گر مانتے ہیں ہم اُس کو ۔ یعنی پہلے وہ جوتے پر ہاتھ مارتا تھا پھر جوتے کے منہ پر تھوک کر باضابطہ رگڑائی شروع کر دیتا تھا۔

ہمارے شاعر صاحب فراغت سے اُلٹی پالتی مار کر بینچ پر بیٹھ گئے پیچھے سے دوسرے نے آواز لگائی کہ حضور! مالش ۔ شاعر تو ایسے موقعوں کی تلاش میں

رہتا ہے اور خاص طور پر شعر اُگلتے وقت دماغ پر تھپکی دینے سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔ خیالات کو دماغ سے پھسلنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے انہوں نے ٹوپی اُتار کر اپنا سر پیچھے کر دیا۔ اب کیا تھا اس نے مالش شروع کر دی۔ چوپاٹی کی ٹھنڈی ہوا۔ جوتوں کی پالش، سر کی مالش اِن سب نے مل کر اُن کی آنکھیں بند کر دیں اور وہ وہیں آنا فانا غفیل ہو گئے۔ ہم یہ تماشا دیکھتے ہوئے آگے نکل گئے۔ لیکن جب آدھے گھنٹے کے بعد واپس آئے تو ہم نے شاعر صاحب کو بجائے شعر وسخن کے جُستجو کے جوتے اور ٹوپی کی جستجو میں پایا۔ یعنی مالش والا ٹوپی اور پالش والا جوتے اُڑا کر چل دیا۔ وہ تھے خوش مذاق۔ ہم نے اُن سے کہا کہ حضور! اب زیادہ فکر نہ کیجئے ٹوپی تو کیا ملتی ہے مگر جوتے آپ کو ضرور مل جائیں گے کہا وہ کیسے؟ ہم نے کہا "وہ زر دنیا دستر در آخرت" کہنے لگے اچھا ہوا میں نے پیسے نہیں دیئے۔ میں نے کہا حضور! پھر گلا شکوہ کاہے کا۔ آپ نے اُن کے پیسے مارے اور اُس نے آپ کے جوتے مارے۔ ۵۵
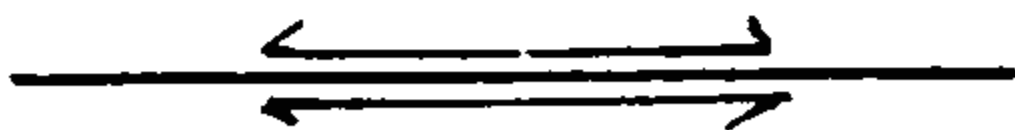
پُرانا مطب

دیکھنا! حکیم جی اُکڑوں بیٹھے ہیں۔ دونوں بغلیں گھٹنوں پر ٹکی ہیں سیدھے ہاتھ میں نرسل کا قلم ہے۔ یہ باپ دادا سے چلا آرہا ہے۔ اس سے نسخہ بھی لکھتے ہیں، کان کا میل بھی نکالتے ہیں، پیٹھ بھی کھجا لیتے ہیں اور ضرورت پڑے تو بمبو کا کام بھی لیتے رہتے ہیں۔ یہ ٹوٹا ہوا کیوں ہے؟ اس سے خطِ شکستہ اچھا لکھا جاتا ہے۔

آنکھیں بند ہیں، افیون کی پینک میں بیٹھے ہیں اور مریضوں کا بھی انتظار ہے۔ ان کی بدرَونق شکل پر نہ جانا یہ بڑے تجربہ کار ہیں۔ خود ہزاروں خوفناک مرضوں میں مُبتلا رہ چکے ہیں۔ کوئی مریض آتا ہے تو اُس کے جوتوں کی آواز سے اُچک پڑتے ہیں۔ تشخیص وہ بَلا کی ہے کہ ذرا چہرے پر نظر ڈالی اور مریض کے خاندان بھر کے مرض پہچان لیے۔ جہاں سمجھ میں نہیں آتا ذرا گردن ٹیڑھی کی اور مریض سے پوچھ لیا وہ مرض بتا دیتا ہے اور یہ اپنی لال کتاب میں دیکھ کر دوا نقل کر دیتے ہیں —— وہ مداری جھولی میں ہاتھ ڈالے کیا تماشہ کر رہا ہے؟ یہاں یہ مداری دواری نہیں، حکیم جی

کا کمپوڈر ہے۔ بڑا مشاق ہے۔ ایک ہاتھ میں نسخہ ہے دوسرا ہاتھ تھیلے میں ڈالتا ہے اور نکال لیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جو جو دوائیں نسخہ میں لکھی ہیں خود اُچک کر اس کے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔

بھلا یہ تو بتائیے کہ مطب میں حکیم جی نے ابابیلیں کیوں پال رکھی ہیں؟

میاں! یہ تو بڑے کام کی ہیں۔ ان کے پروں کی ہوا اور چرپچ کی برکت سے ہزاروں کیڑے مکوڑے اور جراثیم غائب ہو جاتے ہیں۔ کسی مریض کو حکیم جی ان کے گھونسلوں کا جوشاندہ بنا کر پلا دیتے ہیں، کبھی پروں کا خیساندہ بنا کر اُن کے حلق میں ٹپکا دیتے ہیں، کسی کو بیرونی استعمال کے لیے اُن کا لعاب مالش کرنے دے دیتے ہیں اور کسی کو گولیاں بنا کر "حبوب طیور خانگی" کے نام سے کھلا دیتے ہیں۔ جب وبائی امراض پھیلتے ہیں تو یہ غائب ہو جاتی ہیں۔ حکیم جی بھی مرض کے ڈر سے مطب بند کر کے کہیں بھاگ جاتے ہیں۔ صفائی والے جب آسمان پر ابابیلیں اور زمین پر حکیم جی کا مطب کھلا ہوا دیکھتے ہیں تو مقامی اخباروں میں اطلاعیں دے دیتے ہیں کہ اب آب و ہوا صاف ہو گئی ہے۔

حکیم جی مریضوں سے بڑی محبت کرتے ہیں، کوئی بیمار ہوتا ہے تو نسخہ لکھتے ہیں اور دوائیں پلاتے ہیں۔ ناامیدی ہو جاتی ہے تو یٰسین پڑھتے ہیں۔ اور جب وہ مرجاتا ہے تو اس کو نہلاتے ہیں، کفناتے ہیں اور آخر میں اس کے جنازے کو کاندھا دے کر قبرستان پہنچا دیتے ہیں۔ دیکھئے! مطلب چلتے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے مگر اتنا لمبا چوڑا قبرستان بھی کچھ

بھر دیا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ جس کے ہاتھ سے اتنے مریض مرے بھلا اچھے کتنے ہوئے ہوں گے؟

ذرا حکیم جی کا نسخہ دیکھنا، یہ ہوالشافی کون سی دوا ہے؟

میاں یہ دوا نہیں دعا ہے۔ اپنی دواؤں پر بھروسہ نہیں ہے اس لیے مریض کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے مگر لوگوں کا عجیب حال ہے مریض اچھا ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے شفا دی اور مر جاتا ہے تو جہلم تک بے چارے حکیم جی کو گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ ▲▲
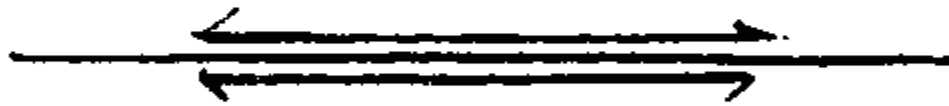
دادا لال بجھکڑ کا تاریخی سفر

دادا لال بجھکڑ کے قصے تو آپ نے بہت سُنے ہوں گے۔ لگے ہاتھوں آج ایک قصہ اور بھی سُن لو۔ ایک دن انہیں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ گھر میں بیٹھے ہوئے مکھیاں مارنے سے کیا فائدہ ارے میاں گھر سے باہر نکلو اور دنیا کی سیر کرو۔ اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، انسان کا تجربہ بڑھتا ہے، نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور وہ آدمی بن جاتا ہے۔

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

یہ شعر گُنگناتے ہوئے دادا لال بجھکڑ اُٹھے۔ ٹوپی سر پہ اوڑھی، تسبیح جیب میں ڈالی، لال کتاب ڈھال پر باندھی اور تلوار ہلاتے ہوئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، پھرتے پھراتے اِدھر اُدھر چکر لگاتے ہوئے ایک شہر میں پہنچے۔ وہاں سب سے پہلے جو چیز نظر سے گزری وہ ایک لمبا چوڑا، اونچا پورا اور بڑے ڈیل ڈول والا سیاہ جانور تھا۔ آپ نے لوگوں سے اس کا نام پوچھا لوگوں نے کہا ہاتھی۔ آپ نے جھٹ اپنی لال کتاب میں لکھ لیا "ہاتھی"۔

تھوڑی دیر سستا کر اور حقہ کا دم لگا کر پھر آگے بڑھے۔ بازار میں پہنچے وہاں دیکھا کہ ایک شخص ٹوکرے میں کچھ گول گول چیزیں رکھے ہوئے لے جا رہا ہے۔ روک کر پوچھا کہ اس چیز کا کیا نام ہے؟ اُس نے کہا "تربوز" اسی طرح گاؤں گاؤں اور شہر شہر آپ سفر کرتے رہے اور نئی نئی چیزیں لکھ کر اپنی لال کتاب سیاہ کرتے رہے۔ کتاب ختم ہوئی تو آپ نے بھی اپنا سفر ختم کر دیا اور اپنے گھر واپس تشریف لے آئے۔

اتفاق دیکھیے کہ دادا کی واپسی کے بعد ہی ایک ہاتھی ان کے گاؤں میں آنکلا۔ تمام لوگ بھاگے اور دُور دُور ہی دُور سے درشن کر کے سوچتے رہے یا بھگوان یہ کیا بلا ہے؟ جب کسی کے سمجھ میں نہ آیا تو سب کے سب ہانپتے ہانپتے دادا کے پاس آئے، تمام واقعات سنائے، اِس جانور کی شکل وصورت بتائی اور پوچھا کہ یہ کون سا جانور ہے اور اِس کا کیا نام ہے؟ دادا یہ بات سُن کر رونے لگے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ بے وقوفو! میں اس لیے رو رہا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد یہ نئی نئی باتیں تمہیں کون بتائے گا۔

دادا کی اس بات پر سب کے سب ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگے۔ اس کے بعد دادا اُٹھے۔ اپنا لباس پہنا، عصا سنبھالا، لال کتاب ہاتھ میں لی اور لوگوں کو ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچے جہاں ہاتھی کھڑا ہوا جھوم رہا تھا۔ آپ نے اِس نئے آئے ہوئے جانور کو غور سے دیکھا۔ پھر دو چار بار اپنی لال کتاب کے ورق اُلٹے اور دیر تک کچھ بڑبڑاتے رہے۔ اتفاق سے ہاتھی اور تربوز ایک ہی صفحہ پر

پاس پاس لکھے ہوئے تھے۔ دادا نے حافظہ پر زور ڈالا۔ باری باری سے ہاتھی امرود؟ ہاتھی اور امرود بار بار دہرایا۔ پھر لوگوں کو مخاطب کر کے فرمانے لگے اے بے وقوفو! اے احمقو! اے ساری دنیا میں اپنے گاؤں کو بدنام کرنے والو۔ دیکھو یہ سیاہ چیز جو تمہارے سامنے کھڑی ہے یا تو ہاتھی ہے یا تربوز ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ اگر یہ ہاتھی نہیں تو تربوز ضرور ہے اور اگر تربوز نہیں تو ہاتھی یقینی ہے۔

یہ بات سُن کر سارے لوگ مارے خوشی کے اُچھلنے لگے۔ سب نے مل کر دادا لال بجھکڑ کو ادھر ہوا میں بلند کر لیا اور گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگے دادا لال بجھکڑ کی جے، دادا لال بجھکڑ کی جے، دادا لال بجھکڑ زندہ باد، دادا لال بجھکڑ زندہ باد۔

دادا کی باچھیں کانوں تک کھلی ہوئی تھیں۔ لوگوں کے کاندھوں پر سوار تھے اور بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس طرح چلے جا رہے تھے جیسے ہوا میں خوشبو، ستاروں میں چاند، اور برات میں دولھا۔ ۸۸

ایک ہندوستانی کہانی

ببّن حجام

کسی زمانے میں ایک راجا تھا اُس کے دو سینگ نکل آئے تھے۔ راجا کو ڈر ہوا کہ اگر کوئی میرے یہ سینگ دیکھ لے گا تو کیا کہے گا اس نے اپنے بال کٹوانے چھوڑ دیئے اور اس طرح اُس کے بالوں میں سینگ چھپ گئے خیر جاڑا تو کسی طرح گزر گیا۔ اب آئی گرمی۔ اتنے بڑے بڑے بالوں سے راجا کا جی گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا کہ ہمارے ہاں کوئی ایسا نائی ہے جس سے کوئی بات کہی جائے اور وہ دوسروں سے نہ کہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں۔ ببن حجام کو بلوائیے وہ ایسا آدمی ہے کہ جان بھی جائے تو بات مُنہ سے نہ نکالے۔ راجا نے ببن حجام کو بُلایا اور کہا ہمارے بال کترو لیکن اگر تم نے ہمارے سینگوں کا ذکر کسی سے کیا تو پھر تمہاری جان کی خیر نہیں۔ ببن حجام نے راجا کے بال کاٹے بہت سا انعام لیا اور چلا گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کا جی چاہا کہ راجہ کے سینگوں کا قصہ دوسروں سے کہے مگر جان کا ڈر تھا۔ پیٹ کا تھا ہلکا، بات کیسے پچتی۔ اُس

کا پیٹ پھولنا شروع ہوا۔ آخر کچھ بن نہ آئی۔ جنگل کی طرف نکل گیا۔ وہاں تھا ایک کنواں۔ اُس نے کہا چلو اِس کنوئیں سے راجا کے سینگوں کا قصہ کہہ دیں۔ کنواں بھلا کس سے جا کر کہے گا۔ یہ سُوچ کر وہ کنوئیں کے پاس گیا اور اندر جھانک کر کہا" ایک راجا کے دو سینگ" اتنا کہنا تھا کہ اس کا پیٹ ہلکا ہوگیا۔

وہ تو اُس کنوئیں میں یہ قصہ کہہ کر چلا آیا اور وہاں آیا لوگوں کا ایک قافلہ۔ انہوں نے دیکھا کہ کنوئیں پر ایک خوبصورت درخت اُگا ہوا ہے۔ اُس کو کاٹ کر انہوں نے سارنگی بنائی، کنوئیں کی مٹی لے کر طبلہ بنایا اور مٹی میں سے کانسی نکلی تھی اُس کے مُجیرے بنائے۔ یہ سب چیزیں بنا بنو گوئیے راجا کے دربار میں آئے۔ راجا نے کہا" اچھا ہمیں گانا سناؤ" اب جو سارنگی والا سارنگی پر گز چلاتا ہے تو اس میں سے آواز نکلتی ہے کہ ایک راجا کے دو سینگ، مُجیرے کہتے ہیں کِتنے نے کہا کنے کہا۔ طبلہ آواز دیتا ہے کہ بِبن حجام نے، بِبن حجام نے۔

راجا کو بڑا غصّہ آیا کہ لو اس نائی نے میرا سارا قصہ اس طرح دنیا میں پھیلا دیا کہ اب سارنگی طبلہ سے بھی وہی آواز آنے لگی۔ بُلاؤ جی اُس نائی کو۔ ہم اُس کی خوب خبر لیں گے۔ بِبن حجام آئے اور انہوں نے کہا۔ اَن داتا۔ آپ کے راز سے میرا پیٹ اتنا پھول گیا تھا کہ اگر میں مُنہ سے نہ نکالتا تو یقین مانیئے وہ پھٹ کر رد ہو جاتا۔ میں نے جنگل میں جا کر کنوئیں میں مُنہ ڈال کر یہ راز کہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کنوئیں کو بھی یہ راز نہیں پچے گا۔ سرکار مالک ہیں اب جو چاہے سزا دیں۔ راجا نے کہا بے وقوف منہ سے

جب بارات نکلتی ہے تو خواہ وہ کنوئیں میں ہی کیوں نہ رکھی جائے ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ تیری سزا بس یہی ہے کہ میرے ملک سے نکل جا۔ اب اگر تو یہاں آیا تو جان سے مار ڈالوں گا۔ بیچارہ حجام روتا پیٹتا اپنے شہر سے نکل خدا معلوم کہاں چلا گیا۔
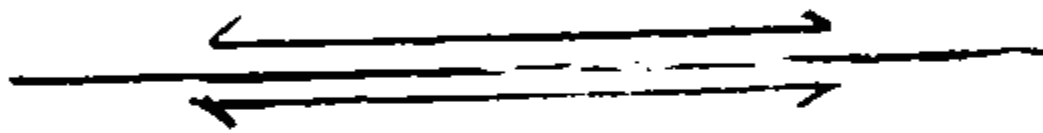
اُلٹی منطق

ایک منطقی شام کے وقت گردن جھکائے اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کچھ سوچتا چلا جا رہا تھا۔ سامنے ایک گہرا گڑھا تھا۔ پاؤں پھسلا اور اڑڑدھم کرکے سر کے بل گرا اور تہ میں جا ٹِکا۔ اُس کے باپ نے جب سُنا تو بھاگتا بھاگتا، ہانپتا کانپتا گڑھے پر آیا اور آواز پر آواز لگانے لگا۔ کہ چلو بیٹا، نکلو اب کب تک کنوئیں میں پڑے رہوگے۔ مگر صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقارخانے میں۔ وہ تو اپنے خیالات میں غرق تھا اور تہ میں ٹِکا، ہوا اپنے اِس اچانک قلابازی۔ کھا جانے کے اسباب پر غور کر رہا تھا۔ باپ نے کان دھر کر سُنا تو پتا چلا کہ وہ اپنے گرنے کے وجوہ اپنی زبان میں اس طرح بڑبڑا بڑبڑا کر ادا کر رہا ہے۔

"حرکتِ مرکزی نے سطحی دباؤ ڈال کر ہم سے ہمارے محور میں باہمی تناقض اور عارضی انحراف پیدا کردیا۔ اس سے قانونِ جاذبہ کے تحت جس کو نیوٹن ثابت کرچکا ہے توازن میں عملِ افتراق و اتصال پیدا ہوگیا جس نے تحت کے جانب ہمیں اتنا کھینچا کہ اِس مجوزی مقام سے جسے کہ گڑھے کی تلنڈی کہتے

میں مزاحمت عمل میں آئی اور ہمارے سر کا تصادم ہو گیا۔"

باپ سے اِس کی یہ بحرانی کیفیت نہیں دیکھی گئی۔ وہ فوراً لپک کر ایک بڑی رسّی لایا اور اُسے گڑھے میں ڈال کہنے لگا کہ بیٹا ہوش میں آ۔ جو ہوا سو ہوا اب اُسے بھول جا اور رسّی کا سرا مضبوط پکڑ لے۔ میں ابھی تجھے اُوپر کھینچ لیتا ہوں۔ منطقی لڑکے نے پوچھا کہ باواجان! رسّی کسے کہتے ہیں۔ باپ نے جواب دیا کہ بیٹا رسّی وہ چیز ہے کہ جب کوئی گڑھے میں گرے اور خود نہ نکل سکے تو وہ اِس کا سرا پکڑ کر اُوپر آجاتا ہے۔

منطقی بیٹے نے اسی طرح سر کے بل ٹکے ہوئے کہا کہ آپ کوئی ایسی میکانکی تجویز بروئے کار کیوں نہ لائے جس کی برقی قوت یا متحرک چرخیوں کے نظام سے میں خود بخود باہر آجاتا اور رسّی کا سرا پکڑنے کی مصیبت سے بچ جاتا۔ باپ نے جواب دیا کہ بیٹا! تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ اِن چیزوں کے فراہم کرنے میں وقت اور روپیہ درکار ہے۔

منطقی بیٹے نے کہا کہ پہلے تو یہ بتلایئے کہ وقت کے کیا معنی ہیں؟ باپ نے جواب دیا کہ وقت تو ایک ایسی نعمت ہے جسکو میں تم جیسے بےکاروں پر صرف کرنا نہیں چاہتا۔ اب برقی قوت کی فراہمی اور متحرک چرخیوں کی تیاری تک تم مزے سے یہیں پڑے رہو۔ اس لیے کہ تم جیسے منطقیوں کے لئے اس سے بہتر کوئی اور مقام نہیں ہوسکتا۔ یہ کہہ کر باپ تو رفوچکر ہوا اور منطقی بیٹا گڑھے کی تہ میں اسی چکر میں پڑا رہا کہ گرنے کا کیا سبب ہے!!

▲▲

میاں بیوی کی تین پانچ

مسٹر گرین سے یہ مری دوسری ملاقات تھی۔ میں اور وہ ڈرائینگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ مسز گرین لمبے لمبے ڈگیں مارتی ہوئی آئیں اور مسٹر گرین کو ترچھی نظروں سے دیکھ کر بولیں "تین"

مسٹر گرین — منہ بنا کر "دو"

مسز گرین — آنکھیں پھاڑ کر "بائیس"

مسٹر گرین — چار

مسز گرین — چھے

مسٹر گرین — پانچ

اِس چھے پانچ کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو گھور کر دیکھا اس کے بعد مسز گرین نے میز پہ ہاتھ مار کر کہا "سترہ" یہ عدد سنتے ہی مسٹر گرین کا چہرہ چقندر کی طرح لال ہو گیا اور نیلے نیلے دیدے نکال کر بولے "ننانوے" میم صاحب اپنے دونوں ہاتھوں کو سر سے مار کر تھرکنے لگیں اور زمین پہ پاؤں پٹک پٹک کر اُول فول بکنے لگیں۔ صاحب نے یہ کیفیت دیکھی تو دُم دبا کر بھاگے۔ میم صاحب

ان کے پیچھے لپکیں ۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میم صاحب۔ میم صاحب کے ہاتھ میں ایک لال کتاب تھی۔ بھاگتے بھاگتے انہوں نے ۱۲ ... ایک چلتی ہوئی نگاہ دوڑائی اور چیخ کر نہایت غصہ سے کہا " انیس ۱۹ "۔ صاحب نے بھی اس کے جواب میں ایک چھوٹا موٹا عدد کھینچ مارا مگر وہ میرے کان تک نہیں پہنچا۔ لیکن اس کا اثر میم صاحب پر اتنا ہوا کہ لال پیلی ہوگئیں لال کتاب جو زور سے پھینکی تو ٹھیک میرے سر پر آگر لگی اور وہ دونوں ہاتھوں اپنے سر پر طبلہ بجاتی ون ٹو تھری ہوگئیں۔

میں شش و پنج میں تھا کہ یا الٰہی یہ چھے پانچ ہوتے ہوتے تین پانچ کیسے ہوگئے۔ یہ عدد تو تھری ناٹ تھری کا بھی باپ نکلا کہ ایک وار میں میدان صاف کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ میدان خالی ہے وہ لال کتاب اٹھا کر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ اس کے ایک صفحے پر تو عدد لکھے ہیں اور دوسری ان کے معنی ہیں۔ میں نے فوراً اپنے دماغ پہ زور ڈال کر دونوں کی گفتگو پر خیال دوڑایا اور اس لال کتاب کے ذریعے دونوں کی بات چیت کا پتا چلا یا۔ وہ آپ بھی سن لیجئے۔

مسز گرین : تین یعنی تم نے سینما کا ٹکٹ خریدا یا نہیں ؟

مسٹر گرین : دو یعنی نہیں خریدا

مسز گرین : بائیس " تم بھی عجیب آدمی ہو کیوں نہیں خریدا

مسٹر گرین : چار " نئے آدمی کے سامنے اس قسم کی باتیں مت کرو

مسز گرین : چھے " میں برابر کروں گی۔

مسٹر گرین : بارہ یعنی عورتوں کی عقل نہیں ہوتی
مسز گرین : سترہ " مردوں میں کہاں عقل ہوتی ہے
مسٹر گرین : ننانوے " بس اپنی زبان بند کرو
مسز گرین : انیس " منہ سنبھال کر بات کرو۔

میں کوئی ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھا ہوا ان کا انتظار کرتا رہا مگر وہ تو ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ جب ان کے آنے کی کوئی اُمید نہ رہی تو میں نے پھر لال کتاب کی مدد سے اُسی کوڈ میں ایک خط لکھ ڈالا اور اسے وہیں رکھ کر میں اپنے گھر واپس چلا آیا۔ وہ خط آپ بھی سُن لیجئے۔
۱۴۲، ۱۱۱، ۷۷، ۳۵۶، ۱۱۳، ۱۳۳۹، ۱۳۱۳ ہماری زبان میں اس کا یہ مطلب ہے :-

دوستو ! تم دونوں کے انتظار میں میں ایک گھنٹے تک سوکھتا رہا مگر تم دونوں ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ میں تو آپ کو نئے سال کی مبارک باد دینے آیا تھا مگر تمہارے تین پانچ نے میرے چھکے چھڑا دیے۔ یارو ! یہ نیا سال ہے لڑائی پر تین حرف بھیجو اور ننانوے کے پھیر میں نہ پڑو نہیں تو تم دونوں کی زندگی تین تیرہ ہو جائے گی۔

چند روز کے بعد مجھے ان کا ایک لمبا چوڑا خط ملا اس پر اُن دونوں کے دستخط تھے مگر پورے خط پر موٹے قلم سے صرف ایک کا ہندسہ لکھا ہوا تھا۔ خدا جانے یہ ایک سے کیا مطلب تھا۔ کیا یہ تھا کہ

اللہ ایک ہے ۔ یا یہ کہ ہم دو سے ایک ہو گئے یا دونوں کا اشارہ میری طرف تھا کہ میں نمبر ایک کا ہوں ۔ لیکن چونکہ لال کتاب میرے پاس موجود نہیں اس لیے میں اس ایک کا مطلب حل نہ کر سکا اور صفر بن کر رہ گیا ۔
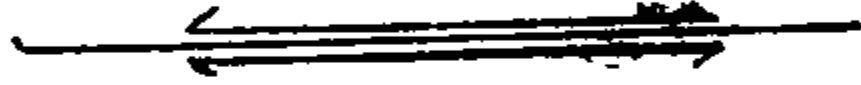
خوجہ آفندی عرف مُلا نصیر الدین المخاطب مُلا صاحب

جس طرح ہندوستان کے عوام مُلا دوپیازہ، راجہ بیربل اور دادا لال بُجھکڑ کی کہانیاں سُن سُن کر دانت باہر نکالتے ہیں بالکل اُسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ایران، ترکی اور عرب کے لوگ ملا نصیر الدین کی باتیں سُن سُن کر قہقہے لگاتے رہتے ہیں، ملا نصیر الدین کون تھے ؟۔ یہ اپنے زمانے کے راجہ بیربل تھے، ملا دوپیازہ تھے، دادا لال بجھکڑ تھے۔ وہ کبھی ایسی ایسی پُر مذاق باتیں کرتے تھے کہ شیخ چلی بھی بغلیں جھانکیں اور کبھی وہ برجستہ جواب دیتے تھے کہ جسے سُن کر بیربل اور مُلا دوپیازہ بھی اپنا سا مُنہ لے کر رہ جائیں۔ کہتے ہیں کہ ملا جی ترکی میں پیدا ہوئے تھے ایک زمانے تک ترکی میں اپنی ترکی بہ ترکی جوابوں اور خوش مذاقی کی آتش بازی سے محفلوں کو گرماتے رہے اور پھر مدتوں ریگزارِ عرب کی خاک چھانی اور برسوں گلستانِ ایران میں ایسی ایسی گلفشانیاں کیں کہ ان ملکوں کے لوگ انہیں نئے نئے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ ترکی میں یہ خوجہ، خوجہ آفندی یا خوجہ نصیر الدین آفندی

کے نام سے مشہور ہیں، ایران میں یہ ملا نصیرالدین کہلاتے ہیں اور عرب کے لوگ انہیں ملاجی کہتے ہیں۔ جس طرح ہمیں دادا لال بجھکڑ پر امریکیوں کو چچا سام پر اور انگریزوں کو جان بل پر فخر ہے اسی طرح ترکوں کو خوجہ آفندی پر فخر ہے جہاں کہیں قہوہ خانہ میں یار لوگ مل کر بیٹھے اور اُن کے لطیفے شروع ہو گئے، مزیدار قہوے اور مزیدار میووں کے ساتھ یار لوگ انکی ذائقہ دار لطیفوں اور میٹھی میٹھی باتوں کے مزے لیتے رہتے ہیں۔ کوئی اُن کی زندگی کے واقعات بیان کرتا ہے تو کوئی ان کی رفتار وگفتار کی تصویر کھینچتا ہے کوئی اُن کی توند کا خاکہ اڑاتا ہے تو کوئی ان کے خچر کا مذاق اُڑاتا ہے، بات یہ ہے کہ اُن کو اپنے خچر سے بڑا پیار تھا وہ اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے گویا یہ سمجھو کہ خوجہ اور خچر ایک جان دو قالب تھے، خچر دیکھنے میں نہایت مریل، دُبلا پتلا اور مدکی معلوم ہوتا تھا مگر رفتار میں برق رفتار تھا اور خوجہ کے ہلکے سے اشارے پر ناچنا شروع کر دیتا تھا۔

بعض لوگوں کی عادت ہے کہ اکثر مانگے تانگے پر کام چلاتے ہیں اور اپنی چیزوں کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے، ایک دن اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا خوجہ کے گھر ان کے ایک دوست پہنچے اور کہا خوجہ صاحب! تھوڑی دیر کے لئے اپنا خچر ذرا دے دیجئے ضرورت ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ خچر تو اس وقت گھر میں نہیں ہے ابھی ایک اور دوست مانگ کر لے گئے ہیں۔ خوجہ نے یہ بات ختم ہی نہیں کی تھی کہ اندر سے خچر کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی، ان کے دوست نے

کہا کہ واہ خوجہ واہ! خچر تو اندر ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ وہ باہر گیا ہوا ہے۔ خوجہ افندی نے تیوری پر بل ڈال کر کہا، "ارے بے وقوف تو بھی عجیب خچر ہے میں کہہ رہا ہوں تو تجھے میری بات کا یقین نہیں آیا اور میرے خچر کی بات کا یقین آ گیا۔"

ملا صاحب کا قد میانہ، رنگ گندمی اور کھوپڑی بالکل سپاٹ تھی پچھلا حصہ چھلے ہوئے کیرد کی طرح صاف اور اگلا درمیانی حصہ آئینہ کی طرح شفاف تھا، ڈاڑھی چکی اور بال جھلسے ہوئے سے تھے کہتے ہیں کہ بالوں میں یہ آگ خود ان کی لگائی ہوئی تھی، بات یہ ہوئی کہ ابتدائی زمانہ میں انہیں الٹی سیدھی کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا، رات کے وقت انہوں نے ایک کتاب میں دیکھا کہ جس کی ڈاڑھی ایک مٹھی سے زیادہ لمبی ہوتی ہے وہ بے وقوف ہوتا ہے، اسے پڑھا تو بھڑک اٹھے اب ڈاڑھی ناپی تو ایک مٹھی سے بھی زیادہ پائی کہ خیال کیا کہ اگر لوگ اس بات سے واقف ہوں گے تو مجھے بے وقوف سمجھیں گے، پہلے تو قینچی ڈھونڈی مگر وہ نہیں ملی تو آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ڈاڑھی کو حساب سے مٹھی بھر کر کھینچا اور باقی حصہ چراغ کی لو سے لگا دیا تاکہ بقیہ زاید حصہ جل جائے مگر وہ حصہ جل کر ہاتھ تک پہونچا انہوں نے پوری کی پوری ڈاڑھی چھوڑ دی نتیجہ یہ ہوا کہ منہ جھلس کر رہ گیا اور ڈاڑھی کے بال مرجھا کر رہ گئے۔

اب سنئے سر کا قصہ کھوپڑی کے بال تو اس طرح غائب تھے جیسے

گدھے کے سر سے سینگ ۔ مگر کنپٹی کے بال اکثر بڑھ بڑھ کر کانوں سے کانا پھوسی کرتے رہتے تھے ، بالوں کی یہ خودسری انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اس لئے ہر چاند کی پہلی تاریخ کو وہ اپنا پورا سر صاف کرادیتے تھے حکم تھا درمیانی سر کا حصہ اُلٹے استرے سے مونڈا جائے بال جلد نکلیں بھلا دنیا میں وہ کون سا بھلامانس ہے جو حجاموں کے ہاتھوں نہ پھنسا ہو' وہ بھی آج کل کے حجام نہیں کوئی ایک ہزار سال پہلے حجام ۔ ! جب وہ سر پر تھوڑا سا پانی ڈال کر دونوں ہاتھوں سے ملنا شروع کرتے تھے بال تو رہے ایک طرف بھیجا تک بھی نرم ہوجاتا تھا اور آخر میں جب وہ سینے کا زور لگا کر دباتے تو گردن کی ہڈیاں بھی چیں بول جاتی تھیں۔

ایک بار ہمارے ملا صاحب بھی اسی نمونے کے حجام کے ہاتھوں جا پھنسے پہلے تو اُس نے سر کو خوب بھگویا پھر دبا دبا کر مالش کی اس کے بعد ایک باوا آدم کے زمانے کا مُنڈا استرا نکال' سر مونڈنا شروع کر دیا ۔ مُنڈا استرا اور اُلٹی حجامت جہاں استرا لگاتا وہاں ایک زخم پیدا ہوجاتا یہ فوراً زخم پر روئی چپکا دیتا۔ مُلّا افندی دیر تک آئینہ ہاتھ میں لئے اپنے سر کی یہ حالت اور حجام کی یہ حرکتوں کو دیکھتے رہے آخر میں اُن سے نہ رہا گیا ۔ ابھی آدھی حجامت ہوئی تھی کہ یہ ایک دم کھڑے ہوگئے اور بولے کہ بس باوا بس ۔ حجام نے کہا کہ کیوں حضور خیریت ؟ انہوں نے کہا بس تم تو آدھے سر میں روئی بو چکے ہو باقی دوسرے حجام کو بقیہ حصے میں گیہوں کی بالیں بولینے دو ۔ !

افندی صاحب کی دستار عجیب و غریب تھی لمبی چوڑی اور بالکل گنبد کے نمونے کی، آپ کے عمامے کا کلس خیالات کی بلندی اور شملہ کی لمبائی علم کی مقدار ظاہر کرتا تھا۔ مگر ان کے مزاج میں بناوٹ کو مطلق دخل نہیں ہوتا تھا، جو بات ہوتی صاف، صاف کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ کسی صاحب کے پاس ایک خط آیا، وہ بھاگے ہوئے ملا افندی صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مہربانی فرما کر یہ خط پڑھ لیجئے، ملا صاحب نے خط کو غور سے دیکھا اور اُسے واپس دے کر کہا کہ معاف فرمایئے یہ خط جرمنی میں لکھا ہے، اِسے میں نہیں پڑھ سکتا۔ اس نے مُلا افندی کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور کہنے لگا کہ اتنا بڑا عمامہ سر پر رکھ چھوڑا ہے اور اتنا سا خط پڑھنے نہیں آتا۔ مُلا افندی نے فوراً اپنے سر سے عمامہ اتار کر اس کے سر پر رکھ دیا اور کہا کہ اگر بڑے عمامے سے ہی خط پڑھا جا سکتا ہے تو لیجئے یہ عمامہ آپ کے سر پر ہے اور اب آپ ہی خود خط پڑھ لیجئے۔ !

اب سنیئے ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ملا صاحب پورے شانِ نزول کے ساتھ جان سے عزیز خچر پر سوار صبح سویرے ایک سفر پہ نکلے، کیا دیکھتے ہیں ایک گاؤں کے نکڑ پر کچھ لڑکیاں جمع ہیں اور کنوئیں سے پانی بھر رہی ہیں اور ہر آنے جانے والے سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں، ملا صاحب کی شامتِ اعمال دیکھئے کہ جب یہ اُن کے قریب سے گذرے تو اُس مریل خچر کی ایسی زوردار آواز کیساتھ ہوا خارج ہوئی کہ ساری کی ساری لڑکیاں،

اُچھل پڑیں اور وہ کبھی ملا اور کبھی خچر کو سر سے پانوں تک دیکھتیں اور زور زور
سے قہقہے لگاتی جاتیں ملا صاحب نہایت غیض وغضب کے عالم میں اُن پر
برس پڑے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ کسی جاندار شئے پہ اسقدر بوجھ
پڑتا ہے تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے ! شومیِ قسمت دیکھئے، اُن لڑکیوں
میں ایک لڑکی بڑی طرار اور مُنہ پھٹ بھی تھی ۔ مُلا صاحب کو مخاطب ہو کر کہنے
لگی ، جی ہاں حضور آپ نے بالکل سچ بات کہی ہے۔ لیکن بھلا کیا آپ بتلینگے
کہ آپکی والدہ محترمہ کی کیا حالت ہوئی ہوگی جو نو مہینے تک آپکا بوجھ ڈھوتے
پھری تھیں ! مُلّا صاحب نے اسی میں اپنی خیریت جانی اور چُپ چاپ وہاں
سے کھسک گئے ۔ بہرکیف یہ ایک ایسے دلچسپ مُلّا کی عجیب وغریب داستانِ
حیات ہے جو ساری عمر علم وحکمت کا ڈھیر سا عمامہ سر پر دھرے دیس بدیس
کی ہوا کھاتے پھرتے رہے۔

▲▲
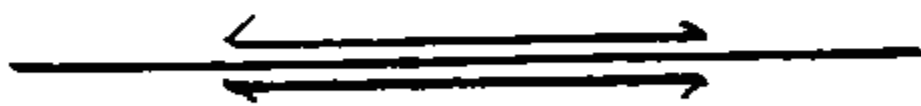
اِملا

اس شمارے میں ہم عصمت اللہ بیگ مرحوم کا مضمون "املا" پر
شائع کر رہے ہیں جو ہم نے ان کی ایک غیر مطبوعہ کتاب سے لیا ہے یہ
کتاب فن طباعت پر ہے اور دراصل یہ مضمون اس کا ایک باب ہے۔ مرحوم
نے یہ کتاب برسوں کی محنت کے بعد لکھی تھی جو تقریباً مکمل ہے۔ افسوس کہ ان کی
عمر نے وفا نہ کی اور وہ اس کو شائع نہ کرا سکے۔ اس کتاب کے مسودے کو دیکھنے
کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ عصمت اللہ بیگ۔ جو ایک مزاح نگار اور ہنسنے ہنسانے
والے شاعر کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے تھے وہ بہت اچھا تحقیقی ذوق اور
علمی مذاق بھی رکھتے تھے۔ کاش ان کی یہ تصنیف شائع ہو جائے جو اردو
میں اپنے موضوع پر غالباً پہلی کتاب ہوگی۔ اریب ایڈیٹر "صبا"

ہر علمی زبان میں اِملا کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ چھوٹی
سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کتاب کھول کر دیکھ لیجئے۔ اِملا میں کہیں دورنگی
نہیں ہونے پاتی۔ وجہ یہ ہے کہ قاعدے مقرر ہیں۔ ہر شخص اُن سے واقف
ہے۔ کاتب غلطی کرتا ہے تو کمپوزیٹر (COMPOSITOR) صحیح
کر دیتا ہے اور کمپوزیٹر غلطی کرتا ہے تو پروف ریڈر (مصحح) درست کر دیتا

ہے۔ برخلاف اِس کے اردو زبان کی کتابیں دیکھو تو کہیں ہجوں میں یکسانی اور یکرنگی نہیں ہے۔ جس کتاب میں دیکھو ایک ہی لفظ ہے مگر مختلف ہجوں میں نظر آتا ہے۔ کسی میں راجہ کا آخری حرف الف سے لکھا ہے تو کسی میں ہائے مختفی سے، کسی میں گزارش "ذ" سے ہے تو کسی میں "ز" سے، کسی میں گھر کھنی دار "ہ" سے ہے تو کسی میں دوچشمی "ھ" سے اور کہیں توتا "ط" سے لکھا ہے تو کہیں "ت" سے۔

غلطیاں کئی قسم کی ہیں۔ اُن میں سے کئی غلطیوں کے اہل قلم بھی ذمہ دار ہیں۔ اِس لیے کہ وہ خود بعض اوقات روانی میں غلط سلط لکھ جاتے ہیں اور آخر میں الزام بیچارے کاتب کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ چنانچہ پہلی غلطی تو یہ ہے کہ منقوطہ حروف پر نقطے نہیں لگاتے مگر کاتب سے اُمید کرتے ہیں کہ وہ اِس فرض کو انجام دے۔ مولانا شبلی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ حرفوں پر نقطے نہیں لگاتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی کو کتابوں کا پارسل بھیج رہے تھے۔ اخراجات وغیرہ کی تفصیل لکھ کر مسودہ ایک خوش نویس صاحب کو دیا خوش نویس نے پورا حساب صحیح لکھا لیکن آخر میں "شبلی عفی عنہ" کو "شتلی بکی" عدد لکھ دیا۔ مولانا تھے نکتہ رس، خوش نویس کی اس اصلاح اور تنبیہ کو تاڑ گئے۔ اُس وقت چائے پی رہے تھے۔ فوراً ایک پیالی خوش نویس صاحب کو پیش کی اور اُس روز سے ہر نقطہ دار حرف پر نقطہ لگانے لگے۔

دوسری یہ عام غلطی ہے کہ بعض مرکب الفاظ جو دو یا دو سے زیادہ

نقطوں سے مل کر بنے ہیں اُن کے اجزا جُدا جُدا یا علٰحدہ علٰحدہ نہیں لکھتے بلکہ سب کو ملا کر لکھ دیتے ہیں جس کا صحیح تلفّظ کرنے میں دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ " نازک ترین " جس کے دو اجزا ہیں ایک صاحب نے بجائے علٰحدہ علٰحدہ لکھنے کے ملا کر " نازکترین " لکھ دیا۔ دوسرے صاحب نے اسے بجائے " نازک ترین " کے نازکترِین " پڑھا۔ اسی طرح ایک صاحب نے " الکٹرک " (الک ٹرک) کو ال کرٹک کلکٹر (کلک ٹر) کو کل کٹرا اور بیٹری (بیٹ ری) کو بیٹری لکھا تھا۔

تیسری غلطی یہ دیکھی گئی ہے کہ جہاں دو لفظوں کے درمیان میں مناسب فصل (SPACE) دینا چاہیئے وہاں زبردستی دے دیا جاتا ہے جس سے عبارت کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص سعدیؔ کا کوئی شعر پڑھ رہا تھا جس کا ایک مصرع یہ ہے کہ سعدی کہ گوے بلاغت ربود " بلا کے بعد فصل تھا اور غت ربود کے ساتھ ملا ہوا۔ مصرع پڑھ کر کہنے لگے کہ معنی تو سمجھ میں آگئے مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ " غتربود " کیا بلا ہے۔ مختصر یہ کہ فصل برابر نہ رہنے سے تمام معاملہ غتربود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ابن الوقت لکھا مگر دونوں اجزا کے درمیان میں فصل تھا (ابن الوقت) ایسے ایک صاحب نے " ابنِ الوقت پڑھا۔ اسی طرح " استغاثہ کا ذبہ " کو استغاثے کا ذُبّہ " پڑھا اور ایک جگہ " دور کا بیاں " لکھا تھا جسے " دُور کا بیان " لکھ دیا۔

چوتھی اہم چیز اعراب اور تشدید ہے۔ عام طور پر ہمارے مصنفین نہ تو کسی حرف پر زیر یا زبر یا پیش لگاتے ہیں اور نہ کسی مشدّد حرف پر تشدید کی علامت بناتے ہیں جس سے صحیح تلفظ کا معلوم ہونا دشوار ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم اعراب نہ دیں تو اِس، اُس، یا دَم اور دُم میں امتیاز نہیں ہوسکتا۔

قاعدہ یہ ہے جس حرف پر کوئی علامت یا اعراب نہ ہو تو اُسے عام طور پر زبر پڑھتے ہیں۔ اس لئے خاص خاص حرفوں پر اُن کی آواز کی مناسبت سے زیر یا پیش ضرور لگانے چاہئیں۔ چونکہ سرے سے ہم اعراب ہی نہیں لگاتے اس لیے سینکڑوں لفظوں کا تلفظ بھی غلط کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ بعض الفاظ کا تلفظ جو زیر سے شروع ہوتا ہے ان کا تلفظ ہم زبر سے کرتے ہیں۔ مثلاً:۔
اِدبار، اِصطبل، تِلمیذ۔ جِد و جُہد۔ جِراحت، رِضا، سِرایت، شِعار۔ شِہاب، عِصمت، رِجعت اور قِندیل وغیرہ۔

اِس کے برخلاف جن الفاظ کا تلفظ زبر سے کرنا چاہیے ان کا تلفظ ہم زیر سے کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

تَہذیب، پَہننا۔ تَعداد، تَلملانا، تَشنہ، جَنوب، حَقارت، حَماقت، خَزاں، خَضرا، رَفاقت، رَواج، سَمت، طَلسم، اَٹھلانا وغیرہ۔

اسی طرح جن الفاظ کی ابتدا میں پیش تھا اُن کا تلفظ ہم زیر سے کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

توانائی، زبان، صُفحہ، خُشر نَشیر وغیرہ۔

تشدید نہ لگانے سے بھی اسی قسم کی دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں بمثال کے طور پر لفظ مشیّن اور ملّتِ والدّین کو لیجیے اگر مشیّن کی "ی" پر تشدید نہ ہو تو مشین ہو جاتا ہے اور "لام" اور "د" پر تشدید نہ دی جائے تو "ملّتِ والدّین" ملت والدین پڑھا جاتا ہے اس لیے جو حرف کہ مکرر آواز دے یا تو قاعدے کے مطابق اس پر تشدید لگانا چاہیئے۔ یا اگر لفظ میں "نا" مصدر کی علامت ہے تو پھر اُس حرف کو دو مرتبہ لکھنا چاہیئے۔

قاعدہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ جن میں نا مصدر کی علامت ظاہر کر رہا ہو تو اُس پر تشدید نہیں لگاتے بلکہ دونوں لکھتے ہیں تاکہ مصدر کی علامت ظاہر ہوتی رہے۔ جیسے۔ سننے سے سُننا۔ چُننے سے چُننا اور گننے سے گننا وغیرہ۔

یورپ کی دوسری زبانوں میں اس قسم کی غلطیاں چھپی ہوئی کتابوں میں ملنا ناممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اِملا کے قاعدے مقرر ہیں، رموز اوقاف کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے، پروف ریڈروں (مصححین) اور کمپوزیٹروں پر خاص طور پر نگرانی کی جاتی ہے اور اُن قاعدوں پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں بھی قاعدے مقرر ہیں۔ چنانچہ: انجمن ترقی اردو کے رسالہ اردو میں ہندوستانی اکاڈیمی کے تماہی رسالے میں اور عثمانیہ

ٹریننگ کالج کے رسالہ "المعلم" میں کئی مضمون اس موضوع پر شائع ہو چکے ہیں۔ اگر ہم اُن قواعد کی پابندی کریں، کاپی نویسوں پر نگرانی رکھیں اور پروف ریڈروں کو تنبیہ کریں تو یقین ہے کہ بہت جلد ہماری تحریروں میں بھی یکرنگی اور یکسانی پیدا ہو جائے گی اور آئندہ لوگوں کا مذاق خراب نہ ہونے پائے گا۔
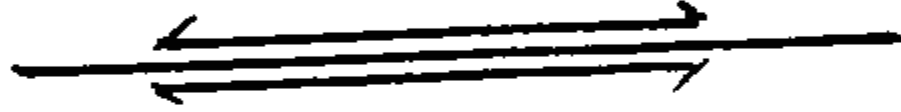
عالمی کیلنڈر

کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں ایک قاضی جی تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ وہ روز رات کے وقت بڑے اہتمام سے بکری کی ایک مینگنی اپنے دست مبارک سے مٹی کی ایک کلیا میں ڈال دیا کرتے تھے۔ بڑے سویرے گاؤں والے روز ان سے تاریخ معلوم کرنے آتے تھے۔ قاضی صاحب تشریف لاتے، چادر میں لپٹی ہوئی کلیا حاضر کی جاتی۔ روز وہ آہستہ سے کلیا میں ہاتھ ڈال کر مینگنیاں گنتے جتنی مینگیاں ہوتیں وہ اتنی ہی تاریخ بتا دیتے۔ لوگ اس شعبدے بازی سے حیران تھے اور کسی خدا کے بندے کے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قاضی جی کلیا میں کیا گڑ بڑ کرتے رہتے ہیں اور کس طرح روزانہ صحیح تاریخ بتا دیا کرتے ہیں۔ اتفاق سے ایک روز کلیا باہر پڑی رہ گئی۔ بکری آئی اور جی بھر کے مینگیاں کر گئی۔ قاضی جی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوئی۔ صبح حسب دستور یار لوگ جمع ہوئے اور تاریخ پوچھی۔ قاضی جی نے کلیا میں ہاتھ ڈال کر جو مینگنیاں گننا شروع کیں تو وہ کسی طرح ختم نہیں ہوتیں۔ آخر گھبرا کر بول اٹھے کہ بھئی آج تو نثو تاریخ ہے۔ لوگوں نے کہا حضور آج تک تو ہم اپنے باپ دادا کے زمانے سے ۳۰ر اور ۲۹ر تاریخ تک سنتے چلے آرہے ہیں مگر یہ مہینہ کیا ہوا کہ شیطان کی آنت ہو گیا۔ قاضی جی نے فرمایا کہ بھیا یہ تو مری مہربانی تھی کہ میں نے معاملہ نثو پر ختم کر دیا ورنہ بخدا میری کلیا کی رو سے دیکھا جائے تو آج ہزار دو ہزار تاریخ سے کم نہیں ہوگی۔؟

بس یہی کیفیت ہمارے موجودہ کیلنڈر کی بھی ہے۔ خدا معلوم وہ کون سے

قاضی تھے جنہوں نے مینگنیاں گن کر فروری کے ۲۸ دن بتا دیئے۔ مارچ کے گن کر ۳۱ دن لکھ دیئے اور اپریل کے ۳۰ دن فرما دیئے اور ہم ہیں کہ آمنا صدقنا بغیر کسی اعتراض کے برابر سب کچھ مانتے ہوئے چلے آرہے ہیں اور اس کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتے۔

آج آپ مدرسہ کی کسی لمڈے سے پوچھئے کہ میاں! دن کسے کہتے ہیں تو آنکھیں بند کرکے طوطے کی طرح بول دیگا کہ جناب دن اس وقفہ کا نام ہے جسمیں زمین اپنے محور پر ایک بار گھوم جائے اور یہ وقفہ تقریباً ۲۴ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اب پوچھیے کہ یہ تو ہوا دن، بھلا مہینا کسے کہتے ہیں تو وہ ہنس کر کہے گا کہ جناب مہینہ ایک چاند سے دوسرے چاند کے درمیانی وقفہ کا نام ہے اور یہ وقفہ نہ تو ۲۸ دن کا ہوتا ہے اور ۲۹ دن نہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے اور نہ ۳۱ دن کا بلکہ ساڑھے ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔

چونکہ اس عالمی کیلنڈر کے ذریعہ وقت معلوم کرنے میں زبردست تغیرات کرنے پڑیں گے اس لیے اس بات کا اظہار کردینا مناسب ہوگا کہ موجودہ کیلنڈر کیا چیز ہے اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں کرنا ضروری ہیں؟

کیلنڈر ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے جس پر ہم چند اٹکل پچو مگر مفید سے زمین اور چاند کی حرکتوں کے متعلق محفوظ کرلیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ سوائے ماہ فروری کے بقیہ تمام مہینوں میں ۳۰ یا ۳۱ دن ہوتے ہیں اور ایک سال کے بارہ مہینے یا ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔

مہینے اور سال کی یہ تعریفیں یا دن اور سال کی اصطلاحیں محض اظہار حقائق کی ابتدائی کوشش ہے۔ مثلاً ایک مہینہ ایک پورے چاند سے دوسرے پورے چاند کا درمیانی وقفے یا مدت کا نام ہے۔ یہ وقفہ تو

۳۰ دن کا ہوتا ہے اور نہ ۳۱ دن کا بلکہ تقریباً ۲۹ دن، ۱۲ گھنٹے اور ۴۴ منٹ کا ہوتا ہے اس قسم کے بارہ وقفوں سے ہمیں تقریباً ۳۵۵ دن کا ایک سال حاصل ہوتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک سال کی پوری مدت میں ۳۶۵ دن، ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۵۶۰۱ سیکنڈ ہوتے ہیں اور یہ وہ مدت ہے جس میں زمین اپنے مدار پر سورج کے گرد پوری طور پر گھوم جاتی ہے۔ یعنی ۳۶۵ دن، ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۵۶۰۱ سیکنڈ۔ دراصل ہمارے ایک دن کے ۲۴ گھنٹے بھی اُس وقفے کا محض ایک تخمینہ ہے جس میں زمین اپنے محور پر ایک بار سورج کے مقابل میں گھوم جاتی ہے۔

اسلامی ملکوں میں قمری کیلنڈر رائج ہیں جن کا دارومدار چاند کی مختلف منزلوں اور مرحلوں پر ہے۔

چاند کے منزلوں پر وقت کے اندازہ کرنے والوں میں قدیم بابلی، مصری اور چینی ہیں اور قریب تر زمانے کے لوگ شمالی امریکہ کے انڈین ہیں۔ قدیم یونانیوں کے ہاں ہر ماہ کی ابتدا ماہ کامل یعنی پورے چاند سے ہوتی تھی مگر سال آزادانہ طور پر ۳۶۵ دن کا شمار کیا جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ روم کے بانی رومولس (ROMULUS) نے سال کے ۳۰۴ دن رکھ کر اسے دس مہینوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس کیلنڈر کو موسموں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ اس کے کسی ایک مہینے کو آپ لے لیجئے۔ وہ کسی سال تو کپکپاتے جاڑے میں، کبھی موسم خزاں میں اور کبھی وسط گرما میں آپڑے گا۔

کہتے ہیں کہ رومیولس کا ایک جانشین نیوما (NUMA) نے ۳۵۵ دن کے سال میں دو ماہ کا اضافہ کر کے مہینوں کی اس بے ربطی کو رفع کیا۔ جب یہ بھی کافی نہ ہوا تو ہر آٹھویں سال ایک مہینہ کا اور اضافہ کیا۔ ان تمام حسابات کا نقطہ آغاز سلطنت روم کی بنیاد پر رکھا گیا تھا جسے ہم عام طور پر ۷۵۳ ق۔م کہتے ہیں (ابتدائی رومن ہمارے موجودہ سال کو ۲۷۱۷ (اے۔ یو۔سی ALE - URLEA - CONDIIA) کہتے ہیں۔

جولیو سیزر کے زمانے تک کیلنڈر میں کئی تبدیلیاں ہو چکی تھیں بعض نے مدت ملازمت میں توسیع کرنے کے خاطر بڑھایا اور بعض نے اس میں کمی کرنے کے لیے سال کے دن گھٹا دیے۔ مگر سیزر کے زمانے میں ماہ جنوری موسم خزاں میں تھا، اس نئے اقدام کے لئے اس نے ۴۶ قبل مسیح کے سال میں ۹۰ دن بڑھا دیے۔ مہینوں کی مدتوں میں کمی بیشی کی اور ہر چوتھے سال ایک دن کا اور اضافہ کر دیا۔ اس طرح ۴۶ کا سال تمام سالوں سے بڑا تھا یعنی ۴۴۵ دن کا۔ لیکن کیا یہ ٹھیک تھا ہرگز نہیں۔ یہ بڑی گڑ بڑ کا سال تھا۔ اس کے بعد کاروبار نسبتاً بہتر چلتے رہے۔ اور ہر چوتھے سال ایک دن بڑھانے کی قیصری ترکیب سے سال اور موسموں کے درمیان ربط قائم رہا اور ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک یہ کیلنڈر چلتا رہا۔

اب نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵۸۲ء کے آتے آتے بہار کا نقطہ اعتدال (VERNAL EQUINOX). یعنی وہ دن جس میں دن رات

بلا یمنہ ہو جاتے ہیں۔ دہ دس دن پیچھے رہ گیا۔ پوپ گرے گری سیتر دہم نے اس
کی تصحیح کے لئے دس دن نکال دیئے اور ہدایت دی کہ ۱۵۸۲ء کے ۴ اکتوبر
کے بعد کے دن کو ۱۵ اکتوبر قرار دیا جائے۔ اس طرح موجودہ گرے گورین
گیلنڈر کی بنیاد پڑی۔

اس کیلنڈر کو رومن کیتھولک ملکوں نے فوراً قبول کر لیا مگر پروٹسٹنٹ
اور مشرقی قوموں نے مخالفت کی۔ اس طرح ان دو کیلنڈروں میں (قیصری
اور گری گوری) صحیح دنوں کے نام اور شمار میں صدیوں تک دس دن کا فرق رہا۔ برطانیہ
عظمیٰ اور اس کی نو آبادیات نے ۱۷۵۲ء تک گری گوری کیلنڈر کو اختیار
نہیں کیا۔ اس کے دوسرے سال سویڈن نے اس کی تقلید کی۔ پھر ۱۸۷۳ء میں
جاپان نے، ۱۹۱۲ء میں چین نے ۱۹۱۸ء میں سوویٹ روس نے، ۱۹۲۲ء
میں، رومانیا اور یونان نے اور ۱۹۲۷ء میں ترکی نے اسے اختیار کیا۔

پوپ گرے گوری نے اپنے کیلنڈر کو جدید شکل دینے کے لئے ایک تبدیلی
اور کی اور وہ یہ کہ سال کی ابتدا پہلی جنوری سے کی، بعض قوموں نے ۲۵ دسمبر سے
سال کا آغاز کیا اور بعض مثلاً انگلینڈ نے ۲۵ مارچ سے۔ اس کے بعد چھٹی عیسوی
میں ایک رومن پادری ڈایوسس ایگزی گوئس (DIOUYOUS EXIGUUS)
نامی نے یہ تجویز پیش کی کہ آغاز سال پیدائش مسیح سے شروع کیا جائے۔
رفتہ رفتہ بیشتر ملکوں نے اسے تسلیم کر لیا اور بعد مسیح جس کے لیے انگریزی
میں .A.D استعمال کرتے ہیں وہ ایک لاطینی لفظ ہے (BAUNO DANININ)

جنس کے معنی ہیں ' ہمارے مالک کا سال" (مگر واقعہ یہ ہے کہ آج کل علمانے اپنی تحقیق سے پتا چلایا ہے کہ ڈایائیسن (DEOUYSION) کے زمانہ میں حضرت مسیح کی پیدائش کے متعلق جو خیال تھا اس سے چار سال پہلے وہ پیدا ہو چکے تھے یعنی چار قبل مسیح میں)۔ اس طرح بار بار تصحیح اور ترمیم کے بعد موصوف کیلنڈر تقریباً ۴۰۰ سال تک بغیر کسی تبدیلی کے ہم تک پہنچا ہے۔

فلکیات کے نقطہ نظر سے اب یہ اچھا خاصا ہے۔ اس میں موسم اپنے آنے کے وقت پر آتے رہیں گے اور سال کبیسہ (LIAP YEAR) کے مختلف ترمیمات کے لحاظ سے برابر کیلنڈر میں کئی خامیاں موجود ہیں۔

پہلے تو یہ کہ سال کے دو نصف ایک دوسرے کے برابر نہیں ہیں۔ پہلا نصف ۱۸۱ دن کا ہے تو دوسرا ۱۸۴ دن کا۔ اسی طرح سال کے چوتھائی حصوں میں ۹۰ سے لے کر ۹۲ دن ہیں اور مہینوں میں ۲۸ سے لے کر ۳۱ دن ہیں۔ ماہانہ کارگزاری کے دنوں کی تعداد (ہفتہ میں پانچ دن کے حساب سے) ۲۰ سے ۲۳ دن تک بدلتی رہتی ہے۔ یہ بے قاعدگیاں بعض لوگوں کے لیے ناانصافی کا سبب ہوتی ہیں اور اعداد و شمار میں بے شمار بے قاعدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسے بیکاری کے اعداد ـــ کیونکہ مہینے اور موسم میں توازن نہیں رہتا۔

اب کیلنڈر کی تعطیلات کو لیجئے۔ جیسے کہ ۲۵ر دسمبر ہفتہ میں کسی دن بھی آسکتا ہے اسی طرح ایسٹر کی تعطیل مہینے کی کسی تاریخ میں بھی واقع ہو سکتی ہے۔ ۲۸ سال میں صرف ایک بار کیلنڈر ٹھیک طور پر پیش کیا جاتا ہے

اور ہر شخص کو تاریخیں یاد رکھنے کے لئے چھپے ہوئے کیلنڈر پر نظر دوڑانا ضروری ہے۔ یہ شخص فراہم کرنے کے لیے تمام ملکوں کو سالانہ بکثرت روپیہ اور کاغذ ضائع کرنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ کیلنڈر کا حساب کتاب پیچیدہ اور بے قاعدہ ہے۔ اس لئے اس کی اصلاح کے لیے بکثرت تجویزیں پیش ہوئیں اور اب تو ان کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

کیلنڈروں کی درستی کے سلسلے میں مجلس اقوام نے جن تجویزوں کی جانچ پڑتال کی وہ کسی طرح ۱۵۲ مختلف تجویزوں سے کم نہیں تھیں اور طویل غور و خوض اور مطالعہ کے بعد سوائے دو تجویزوں کے باقی سب کو خارج کر دیا۔

پہلی تجویز میں تو ایک ایسا کیلنڈر تھا جس میں ۲۸، ۲۸ دن کے ۱۳ مہینے تھے۔ دوسرا بارہ مہینے کا تھا جس کے ہر مہینے ۳۰ یا ۳۱ دن تھے مگر سہ ماہی ۹۱ دن کی تھی۔ دونوں کیلنڈروں میں سال کے ۳۶۴ دن ہیں اور ان میں ایک دن چھوڑ دیا ہے جو خصوصی تعطیل کا ہے۔ دونوں کیلنڈروں میں ہفتہ سات دن کا رکھا گیا ہے۔

ان میں سے دوسرا کیلنڈر عالمی کیلنڈر تھا جسے چلی کے نمائندہ نے لیگ میں پیش کیا تھا مگر اسے کافی تائید حاصل نہیں ہوئی اس سے اختیار نہیں کیا گیا۔

مگر ایک بہتر کیلنڈر پیش کرنے کا مطالبہ اب تک جاری ہے۔ ابھی حال میں ہندوستان نے معاشی اور اقتصادی کونسل سے عالمی کیلنڈر

اختیار کرنے کی درخواست کی ہے۔ حکومت ہند نے اسے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مجوزہ عالمی کیلنڈر میں موجودہ کیلنڈر کی خامیاں رفع کر دی گئی ہیں۔ یہ سائنٹفک، یکساں، مستقل اور دائمی ہے اور ہر سال اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اب اس عالمی کیلنڈر کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کے سال کی چاروں سہ ماہیاں ایک ہی مدت یعنی ۹۱ دن کی ہیں۔ اور ہر سہ ماہی کا پہلا دن اور اسی واسطے شش ماہی اور سال ایک ہی دن یعنی اتوار سے شروع ہوتا ہے۔ ہر سہ ماہی کا پہلا مہینہ ۳۱ دن اور بقیہ دو مہینے ۳۰، ۳۰ دن کے ہیں۔ اس میں ایک خامی ضرور ہے جو ناگزیر ہے اور وہ یہ کہ سال کو ایک ہفتہ یعنی سات دن سے تقسیم کریں تو ایک دن بھی نہیں بچتا کیونکہ ۵۲ ضرب ۷ = ۳۶۴ ہوتے ہیں۔ اس لیے تجویز یہ ہے کہ یہ دن عالمی دن کے نام سے موسوم کیا جائے اور ہر سال کے ختم پر اس روز ساری دنیا میں بین قومی تعطیل منائی جائے۔ ہندوستانی تجویز میں اس دن کو عالمگیر ہم آہنگی اور بنی نوع انسان کے اتحاد کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ لیپ کے سالوں میں بھی ہر چوتھے سال اس قسم کی تعطیل دی جائے جس کا عمل ۳۰ جون اور پہلی جولائی کے درمیان میں ہوگا۔

یہ کیلنڈر مستقل ہوگا اور ہر سال بالکل اسی طرح رہے گا۔ ریلویز کو ہر سال جدید نظام الاوقات (TIME SHEDWLE) تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہر شخص کو معلوم رہے گا کہ بڑا دن ہمیشہ پیر کو ہوگا۔

بینک اور تجارتی ادارے بھی اس کو پسند کریں گے کہ سہ ماہی ہفتہ کو ختم ہوتی ہے۔ وہ اپنے حسابات بند کر کے آنے والی نئی سہ ماہی کی تیاری میں مصروف ہو جائیں گے۔ اس غیر متبدل کیلنڈر میں مدرسوں کی میقاتوں کا بھی مستقل طور پر اندراج ہوگا۔

اس تجویز میں اعتراضات بھی ہیں۔ اُن میں سے ایک تو مذہبی ہے اس لئے کہ سال میں ایک بار اور کبیسی سالوں (LEAP YEAR) میں دو بار یکے بعد دیگرے دو سبتھ ڈے کے درمیان ۶ دن سے زیادہ حائل ہوں گے۔

اس سال عالمی کیلنڈر پر بحث کرنے کے لئے ہندوستان نے تجویز پیش کی ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ یہ کیلنڈر اتوار کے دن، پہلی جنوری ۱۹۵۶ء کو دنیا کی قوموں میں نافذ ہو سکے گا۔ اور یہی دن گریگوری اور عالمی کیلنڈر کے لحاظ سے ایک ہوگا۔
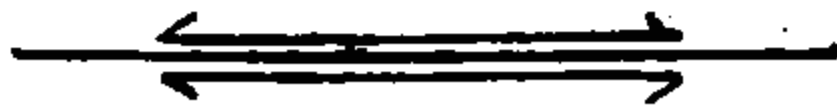
بھائی الف-بے کی سرگذشت

ہمارے ملنے جلنے والوں میں سب سے **عجیب وغریب قسم کے آدمی** خدا بخشے **مرزا الف**-بے (ا-ب) تھے، یہ تھا ان کا نام' وہ خود بھی کہتے تھے نام کے کوئی معنی نہیں ہوتے تھے بھلا چنو میاں کے کیا معنی ہیں اس دنیا میں ہزاروں نام ایسے ہیں جس کے کوئی معنی نہیں جیسے شیخ دادے' کالے خان' اللو پاشاہ' منے میاں' بھلا ان کے کیا معنی ہیں فقط نام رکھنے سے غرض ہے باقی اللہ کا نام ہے۔ مگر دیکھئے نام کے بھی کیا اثرات ہوتے ہیں' ہم نے بھی ان کا نام سنتے ہی دو چار باتیں بتائیں تھیں وہ سب کی سب ایسی چپکیں جیسے لفافے پہ پوسٹل ٹکٹ' ان میں سے معمولی بات آپ بھی سن لیجئے' الف خالی ہوتا ہے یہ تنہائی' آزادی اور مست سانڈ کی علامت ہے' سانڈ کو آپ جانتے ہیں وہ ہمیشہ مگن رہتا ہے۔ کونجڑے کی دوکان سے گذرا تو ترکاری کے ڈھیر پر منہ مار دیا۔ بنئیے کی دوکان کے پاس آیا تو غلے پہ جا گرا۔ اور حلوائی کی دوکان پر پہنچا تو جلیبیاں کھانی شروع کر دیں' لٹھ پہ لٹھ برس رہے ہیں مگر اسے مطلق پرواہ نہیں' تو بس ہمارے بھائی صاحب بھی ساری عمر مگن آزاد و مست رہے آگے ناتھ نہ پیچھے پگھ۔

اب رہا نام کا دوسرا ٹکڑا بے (ب) تو یہ مخفف ہے بیت کا اور

عربی زبان میں بیت کہتے مکان اور گھر کو۔ گھر کی تفصیل تو آپ آگے چل کر سنیں گے، اس وقت یہ نکتہ بتانا ضروری ہے کہ جس طرح بے (ب) کا نقطہ اپنے گھر پر قایم رہتا ہے اُسی طرح یہ بھی اپنے گھر پر قطب کی طرح کھڑے رہیں گے اور رزق حاصل کریں گے۔ اور یہ بات بھی پکی نکلی یعنی پکی پکائی کھیر مفت مل جاتی تھی عمر بھر تفتیشی پولیس چکر لگاتی رہی مگر اُن کے فرشتوں کو بھی یہ پتا نہ چلا کہ ان کی کمائی کا ذریعہ کیا ہے؟

یہ تو ہوئی تمہید اب آپ ان کا کچا چٹھا بھی سُن لیجئے۔ تھے بڑے یار باش اور ہنس مکھ۔ ان کے سر کو دُور سے دیکھو تو چھلا ہوا کپھوا معلوم ہوتا تھا، جگنو کی طرح آنکھیں تھیں اور داڑھی چگی تھی جو رنگ برنگ دیسی اور بردیسی خضابوں کے استعمال سے کہیں سُرخ، کہیں ہری کہیں کالی تھی انہوں نے اپنی عمر، عمر بھر چھپائی اور کبھی بھی کسی کو صحیح نہیں بتائی آخر میں کمر کا عالم ہوگیا کہ چلتے پھرتے سر سجدہ رہتے تھے کو کمر کے متعلق پوچھتا تو جھٹ سے یہ شعر پڑھتے۔

خمیدہ پُشت نہیں ہوں میں ضعف پیری سے
زمین ڈھونڈھ رہا ہوں مزار کے قابل

وہ ہمیشہ صاف سُتھرے کپڑے پہنتے تھے گھر سے چلتے وقت دو چار لیمو جیب میں ڈال لیتے تھے جہاں کسی شریف آدمی کو کھانا کھاتے دیکھتے سلام کر کے روز یہ بھی جا ڈٹتے، مُرغن ڈِش دیکھتے ہی کہتے کہ حضرت لیموں اس کا

ذائقہ ہے ۔ ذرا کاٹ کر ڈالئے پھر دیکھئے اس کا ذریعہ کہیں سے کہیں ہو جاتا ہے وہ بیچارا مروت میں آکر دعوت دیتا ہے، یہ فوراً دسترخوان پر جا ڈٹتے اور اناڑی کی بندوق بھر کر موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں ۔ اگر راستہ میں کوئی شکار نہ گھٹتا تو یہ سیدھے اس کے گھر پہنچتے ۔ وہ بیچارا اپنے دفتر یا کاروبار کی فکر میں ہوتا دسترخوان بچھا ہوا دیکھتے ۔ وہ بیچارا پوچھتا بھائی کچھ کھاؤگے یہ کہتے ۔ نہیں ! اجی بھائی صاحب میں تو خوب کھا کر پی کر آیا ہوں تھوڑی دیر بعد ذرا دسترخوان کو گھورتے اور پوچھتے کہ بھئی تمہاری اس رکابی میں کیا رکھا ہوا ہے ۔ وہ کہتا کہ شلغم ہے ۔ یہ بولتے اوہو شلغم نکل آئے ہیں ۔ میں نے کئی دفعہ شلغم لانے کو کہا مگر ہمارا نوکر ایسا کمینہ ہے کہ جب پوچھو یہی کہتا ہے کہ ابھی شلغم نہیں نکلے ۔ خیر کیا ہرج ہے ہم تمہارے یہاں ہی اس ترکاری کا مزہ لینگے ۔ یہ کہہ کر دسترخوان پر جا ڈٹتے اور پانچ چھ پراٹھے کھا کر دسترخوان سے اُٹھتے ۔

کہیں بیٹھے بیٹھے فرماتے ارے میاں ! سامنے والے کٹورے میں کیا ہے وہ کہتا کہ مرل کا سالن ہے یہ کہتے اوہو مرل بازار میں آگئی ہے ! میں کئی دفعہ اپنے نوکر سے کہا کہ مرل مچھلیاں لاکر تل دے وہ حرامزادہ یہی کہتا ہے کہ ابھی مرل مچھلی بازار میں آئی ہی نہیں چلو بھئی تمہارے ہاں ہی مرل کو چکھ لیں غرض کہ یہاں بیٹھ کر مرل اڑالی اور جو سالن بھی پیچ میں رہتا اس پر بھی اچھی طرح سے ہاتھ صاف کرتے اور موچھوں پر تاؤ دے کر گھر کا راستہ ناپتے ۔

جب کسی دن کوئی اُلّو نہیں گھٹتا تو کسی بھی معمولی آدمی کے گھر پہنچ جاتے اور آتے ہی کہتے کہو بھائی ! آج کیا پکا ئے ہو ! وہ کہتا مرزا جی ! آج تو ماش کی دال پکائی ہے۔ وہ کہتے بھئی کیا کہیں ہم تو مرغ و ماہی کھاتے کھاتے تھک گئے ہیں۔ دال کو جی چاہتا ہے مگر ہمارا نوکر ایسا نالائق ہے کہ کبھی دال پکاتا ہی نہیں ہے لاؤ دیکھیں تم کس مزے کی دال پکاتے ہو اس بیچارے نے ساری کی ساری روٹیاں اور دال نکال۔ سامنے رکھ دی اور یہ سارے کا سارا مال چٹ کر گئے۔ غرض یہ کہ یہ صبح سے لے کر شام تک گردش پرکار کی طرح اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے چکر لگاتے رہتے تھے۔

ظرافت اور خوش مذاقی تو اللہ میاں نے ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ مگر خدا نہ خواستہ ہزل گوئی اور بے تکی شاعری کے فن میں بھی کوئی ڈگری دی جاتی تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ انہیں دنیا کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی آنکھیں بند کر کے P.H.D کی ڈگری دیتی۔ اور آج سے پچاس سال پہلے انہیں نوبل پرائز مل چکا ہوتا۔ شعر و شاعری سے انہیں قدرتی لگاؤ تھا۔ ہندوستان کے ہر بڑے سے بڑے شاعر کی کوئی نہ کوئی بات ان میں پائی جاتی تھی۔ چنانچہ فصیح الملک داغ دہلوی کی طرح ان کا رنگ کالا کلوٹا تھا، استاد ذوق کی طرح منہ پر چیچک کے داغ تھے، استاد ناسخ کی طرح موٹے تازے دُم کٹے دُنبے کی طرح جسے ہوئے تھے۔ جانِ عالم کی طرح رنگین مزاج تھے بد دماغی میں میر کے ہمسر تھے، مزاج سودا غالب تھا بات بات میں انشاء اللہ اور ماشاء اللہ،

نوک زبان پر چڑھا ہوا تھا، غصے میں آتش تھے اور شعروشاعری کے میدان میں
نجم الدولہ حضرت غالب دہلوی کی طرح سب سے الگ ایک نئی ڈگر پر چلے۔
بعض اوقات جوش میں آکر شعر کہتے تو ایک مصرع گنگا جی کا پاٹ ہو جاتا دوسرا سکڑ کر موسیٰ ندی کا گھاٹ بن جاتا تھا مگر شعر کا مطلب ان کے پیٹ کے
اندر ہی اندر چکر لگاتا رہتا تھا۔

صفتِ مغرب میں انہیں اتنی مشق حاصل تھی کہ آخر میں سیدھی بات
بھی ان کی زبان سے الٹی نکلنے لگی تھی صرف دانشور ہی اس بات کو سمجھتے مگر لاعلم لوگ
تو بغلیں جھانکتے رہ جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ چودھری نصرت علی کو دہ چودھری حسرت
علی کہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہ میرے بھائی زاد خالہ آئے ہوئے
ہیں (یعنی خالہ زاد بھائی) انہوں نے ایک خضاب بنایا تھا کہنے لگے صفات
سفید بالے ہوجاتے ہیں جب ایک فرمائش قہقہہ پڑا تو کچھ سوچ کر کہنے لگے میرا
مطلب یہ ہے کہ بالے کال سفید ہوجاتے ہیں۔ ایک بار میں آن کے ہاں گیا تو
ننگ دھڑنگ بیٹھے تھے۔ اور صرف نام کو ایک دو انگل کی لنگوٹی اٹکا رکھی
تھی، میں نے کہا کہ بھائی کیا ڈنڈ بیٹھک کر رہے ہو؟ کہنے لگے اے میاں
فنا کی پناہ کیا غضب کی گرمی ہے۔ اس نے تو مجھے ضبط النحواس (ضبط الحواس)
کر دیا ہے۔ اس سے طبع المخلع ہوکر بیٹھ گیا ہوں۔

اب ہمارے بھائی صاحب بیت یعنی گھر کی کیفیت بھی سُن لیجئے
گھر تو تھا دومنزلہ، پہلی منزل نے تو خسرو کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی

تھی اور دوسری منزل نے طاق کسریٰ کو بھی بالائے طاق پر رکھ دیا تھا چنانچہ اس کا آدھا حصہ تو بالکل کھنڈر تھا اور آدھا حصہ پر اللہ میاں کو یاد کرتا ہوا ایک ٹانگ پر کھڑا تھا ٹوٹی ہوئی دیواروں پر کثرت سے گھاس اُگی ہوئی تھی اس سے دو فائدے تھے۔ پہلا تو یہ ہے کہ اس سرسبز منظر سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہتے تھے اسلئے کہ وہ آشوب چشم کے مرض میں مبتلا تھے۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ گھاس پاس کی بکریوں کے لئے چراگاہ کا کام دیتا تھا یعنی اِدھر اُدھر کی بکریوں نے اپنا اڈہ بنا رکھا تھا ان بکریوں پر وہ اپنا ہی نہیں بلکہ اپنے باپ دادا کی ملکیت ثابت کر دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ دنیا کے بڑے بڑے رشی منی ان کا دودھ پیتے چلے آرہے ہیں بات یہ ہے کہ بکریوں کے دودھ میں وٹامنس یعنی حیاتین بھری ہوتی ہے۔ A.B.C یہ تینوں وٹامنس اس میں موجود رہتے ہیں جو انسان کی صحت کو قائم رکھتے ہیں۔ ہاضمے کو بڑھاتے ہیں اعضا کے فعل کو درست رکھتے ہیں اور دانتوں کو امراض سے محفوظ اور مضبوط رکھتے ہیں۔ اتنی گواہی تو ہم بھی دیتے ہیں کہ اُن کے منہ میں پورے دانت موجود تھے اور ہنستے وقت ان کی سیاہ صورت پر اس طرح چمکتے تھے جیسے اندھیرے میں گور دزن قبر سے مُردے کی سفید ہڈیاں۔

صبح سے لیکر شام تک وہ بجائے پانی کے دودھ پیتے رہتے تھے۔ پھر کمال یہ تھا کہ وہ جس بکری کا دودھ پینا چاہتے بس وہی بکری بڑی محبت سے اُنہیں دیکھتی ہوئی پاس آجاتی تھی یہ کیا بات تھی؟ بات یہ ہے کہ انہیں

آواز بنانے میں بڑا کمال حاصل تھا جس بکری کو بلانا چاہتے تھے اُس کے بچے کی آواز اس خوبی سے نکالتے کہ بس وہ بکری خود دھوکا کھا جاتی اور میں میں کرتی ہوئی اُن کے پاس چلی آتی تھی یہ فوراً منہ لگا کر سارا کا سارا دودھ ہڑپ کر جاتے کہتے ہیں کہ براست منہ لگا کر دودھ پینے سے اصلی ایوٹ اور اچھوت اور سب کے سب وٹامنس جوں کے توں پیٹ میں اتر جاتے ہیں۔ اچھا تو یہ حصہ بکریوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ رہا بالائی منزل کا حصہ تو اس پر وہ خود براجمان تھے زینہ کی سیڑھیاں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ مگر بھائی کو اُس پر چڑھنے کی خاص مشق تھی اور وہ آنکھیں بند کر کے بکریوں کی طرح کودتے پھلانگتے اوپر چڑھ جاتے تھے جب کوئی نیا آدمی آتا تو کہتے کہ دیکھو میاں! ہوشیاری سے، دوسری سیڑھی پر پانوں نہ رکھنا اب چوتھی سیڑھی پر ہاتھ ٹیک دو۔ بس یہاں ہاتھ پر زور ڈال کر پانوں اوپر کھینچو۔ ہے شاباش۔ اچھا اٹھو بس اپنا سیدھا ہاتھ مجھے دیدو۔ وہ ہاتھ بڑھاتا اور یہ اسے پکڑ کر اوپر کھینچ لیتے۔

بالائی منزل کی چھت کویلوں کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی قدیم رسدگاہ کے نمونے پر بنائی گئی ہے یعنی اس میں ہزارہا سوراخ تھے جن میں سے رات کے وقت چاند ستارے اور نظام شمسی کے سیاروں کی گردشیں نہایت آسانی کے ساتھ معائنہ کی جا سکتی تھیں۔ چھت کی یہ کیفیت تھی کہ ابابیلوں نے سیکڑوں گھونسلے قمقموں کے جھاڑ کی صورت میں لٹکا دیئے تھے اور جنگلی

کبوتروں نے اپنی صاف ستھری بیٹ کا پلاسٹر دیواروں کی طرف کر رکھا تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ ہم نے غلطی سے ایک الماری کا پٹ کھول دیا تو کیا دیکھتے ہیں اس میں مچھروں کا ایک لشکر جرار کیمپ ڈالے پڑا ہے اس میں ہر رنگ، نسل اور ہر وضع قطع کے مچھر ہیں پھر بڑی خوبی یہ تھی کہ پہلی روپ سے لے کر بدھ روپ یعنی انڈوں کی حالت سے لے کر بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا بھی تفصیلی طور پر معائینہ کیا جا سکتا تھا۔ ان مچھروں کی تولید اور پرورش کا جو انتظام اور اہتمام ہمارے بھائی صاحب نے اپنے گھر میں کیا تھا اس کی نظیر دنیا کے بڑے بڑے ملیریا کے تحقیقاتی اداروں اور تجربہ گاہوں میں بھی نہیں ملے گی۔

۸۸
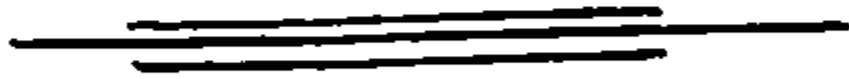
قصہ ایک سفر کا

ہمارا ہمیشہ کا مقررہ پروگرام یہ ہے کہ ہر سال حیدرآباد سے تقریباً ہزار دو ہزار میل فاصلہ تک سیر و سیاحت کو نکل جاتے ہیں اور مہینے سوا مہینے اِدھر اُدھر ٹانک ٹوئیے مار کر پھر واپس چلے آتے ہیں۔ ایک مرتبہ یہ رائے قرار پائی کہ اِس سال موٹر سے سفر کریں۔ حیدرآباد سے روانہ ہوں۔ پہلے ہمنا آباد مقام رہے، اس کے بعد مرہٹہ ریاستیں، سانگلی، کولھاپور، مرج، گوا۔ گوا میں فادر کرسمس کے ساتھ کرسمس کی عید منا کر بیبار چل دیں۔ پھر جرسپا کی سیر کے بعد سمندر کے کنارے سفر کرتے ہوئے راس کماری تک پہنچیں اور وہاں بحرِ ہند میں اشنان کرکے، احاطہ مدراس کے مشہور و معروف مندروں کے درشن کرتے ہوئے حیدرآباد آ دھمکیں۔ ایک روز آرام لیں اور دوسرے روز سے اپنے کاروبار سے جٹ جائیں۔

اب کیا تھا سفر کی تیاری شروع ہوگئی۔ حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ تین ہزار میل کا سفر ہے۔ موٹر کا تو فکر نہ تھا اس لیے کہ وہ نئی تھی رہے ہم تو ہمارا بھی بیمہ ہو چکا تھا۔ ہم مع اپنے لاؤ لشکر کے پچھے آدمی تھے کپڑے لتے، پٹرول، ٹائر ٹیوب، فلہ، دیگ چیاں، مرہم پٹی وغیرہ تھا

سامان اتنا ہو گیا تھا کہ جب اسے موٹر پر آگے پیچھے اندر باہر لادا گیا اور رسیوں سے اچھی طرح کس دیا گیا تو ہماری موٹر کی شکل و صورت ایک بد جانور کی سی بن گئی۔ اس شان و شوکت سے ہم روانہ ہوئے۔

جر سپہ کا رستہ نہایت دلفریب ہے جنگل میں سے جو سڑک جاتی ہے اس کی عجیب کیفیت ہے۔ پندرہ بیس فٹ چوڑی، لال ایسی کہ بیر بہوٹی اور صاف ستھری اس قدر کہ گویا ابھی جھاڑو ہوئی ہے۔ دونوں جانب اونچے اونچے درخت، موٹے موٹے تنے، تنوں سے لپٹی ہوئی بیلیں معلوم ہوتا تھا کہ گویا جنگل کی گلپوشی ہو رہی ہے۔ میلوں نکل گئے۔ دوپہر کا وقت ہے مگر کہیں دھوپ کا سایہ تک نہیں ملتا۔ آگے دیکھو یا پیچھے سڑک نہیں صحرائی مانگ ہے جس میں کسی نے سیندور بھر دیا ہے۔ وہ دیکھو! یہاں سے اتار شروع ہوتا ہے۔ اس غضب کا اتار کہ موٹر خود بخود پھسلتی چلی جا رہی ہے اور پٹرول کا ایک قطرہ استعمال نہیں ہو رہا ہے نشیب بھی نشیب کہ خدا جھوٹ نہ بلائے تو مسلسل چالیس میل تک ڈھال چلا گیا تھا۔ رستے بھر سروے آف انڈیا کے نقشہ پر تنقید ہوتی رہی۔ نقشہ کہتا تھا کہ جر سپا ۱۶۴۰ فٹ سطح سمندر سے اونچا ہے۔ ہم کہتے تھے کہ نقشہ جھوٹ کہتا ہے اگر ڈھال کا یہی عالم رہا تو ہم تھوڑی دیر میں سطح سمندر سے دو سو فٹ نیچے پہنچ جائیں گے اسی رو دقدم میں شام ہو گئی۔ اتنے میں ایک موڑ آیا۔ موٹر کا مڑنا تھا کہ دھائیں دھائیں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ پانی کے چشمے، ندیاں اور نالے

جو ہمارے ساتھ ساتھ میل سے برابر بہتے چلے آرہے تھے وہ سب کے سب یہاں پہنچ کر شیوراتری ندی سے مل گئے۔ اس مقام سے شیوراتری بڑے آب وتاب سے بہہ رہی تھی۔ پاٹ بھی چوڑا ہوگیا تھا اور روانی میں بھی تیزی آگئی تھی۔ جس طرف منہ اٹھائیے لوگوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ اُن کے ہاتھوں میں قندیلیں کس طرح چمک رہی تھیں جیسے اندھیری رات میں جگنو۔ بون فائر BONE FIRE کا عکس پانی میں عجیب لطف دے رہا تھا۔ غرض یہ کہ ہم لوگ دور سے آتش بازی کا لطف اٹھاتے ہوئے ایک بلند مقام پر جا پہنچے۔ یہاں ایک نہایت خوبصورت مسافر بنگلہ ہے جو بمبئی پریزیڈنسی کے علاقہ میں ہے۔ شیوراتری صوبہ بمبئی کے عظیم الشان وادیوں میں کودتی پھلانگتی میسور کے سرسبز اور گھنے جنگلوں کو سیراب کرتی ہوئی اس مقام پر پہنچ کر تقریباً ۲۰ سو فٹ چوڑی ہوجاتی ہے اور ۹۶۰ فٹ اونچے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرتی ہے۔

یوں تو ہندوستان میں آبشار ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ دروغ برگردن راوی، ہندوستان تو رہا ایک طرف دنیا کے کئی مشہور ومعروف آبشار بھی اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ مثلاً :- کہتے ہیں کہ سیرو سولی آبشار (SERO SALI FALL) ۲۴۰۰ فٹ بلند ہے۔ ایون سن آبشار (EVEN SON FALL) آلپ میں ۱۲۰۰ فٹ بلندی سے گرتا ہے اور آروے آبشار (ARVE FALL) ۱۱۰۰ فٹ بلند۔ جرسپا بلندی میں اُن سے کم ہے مگر مقدار آب جو اس میں بہہ رہا ہے وہ اُن سب سے

زیادہ ہے۔

رہا نائیگرا آبشار (NEAGERA FALL) تو دنیا میں سب سے بڑا ہونے کے باوجود صرف ۱۶۴ فٹ بلند ہے مگر جرسپا آبشار بلندی میں اس سے چھ گن زیادہ اونچا ہے۔ امریکہ، چین، جاپان اور دوسرے ملک کے سیاح دور دراز مقاموں سے اسے دیکھنے آتے ہیں اور رات کے دو دو بجے تک بیٹھے ہوئے آتش بازی، اون فائر اور آبشار کے لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ پانی کی مار سے پہاڑ کٹ کر نعل کی طرح ہو گیا ہے اگر مقابل میں کھڑے ہو کر دیکھو تو اس پر سے چار پانی کی چادریں گرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ سب سے بڑی چادر بالکل سامنے گرتی ہے جو راجہ نال کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک چادر پتھروں سے ٹکراتی ہوئی نہایت جوش و خروش سے چٹانوں پر بہتی ہوئی راجہ نال سے مل جاتی ہے اس کو رودر (ROAWER) کہتے ہیں۔ اس کے نزدیک ہی تیسری آبشار ہے۔ اسے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ سفید رنگ کا انار چھوٹ رہا ہے۔ اس کا نام راکٹ (ROCKET) ہے۔ اور چوتھی آبشار سب سے علٰحدہ ایک غمگین عورت کی طرح آبی چادر اوڑھے ہوئے دکھائی دیتی ہے اس کو ڈیم بلاسش (DAME BLAUCH) کہتے ہیں۔ ان چاروں کی کیفیت دور سے دیکھنے کے قابل ہے۔ پانی تو نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اور صرف جھاگ اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

بلمکی بنگلے سے دقت واحد میں تین آبشار نظر آتے ہیں مگر مقام کی بلندی سرسبز وادی کی کیفیت اور ندی کی روانی تفصیل سے دکھائی دیتی ہے یہاں سے چار پانچ فرلانگ پر ایک اور مسافر خانہ ہے جو میسور کے بنگلے کے نام سے مشہور ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ آبشار دیکھنے کا لطف بس یہیں آتا ہے۔ ایک طرف تو راجہ صاحب غوطہ مارتے ہوئے صاف دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف ان کے شاگرد ہمیشہ قلابازیاں کھاتے اور شور وغل مچاتے ہوئے پوری طور پر نظر آتے ہیں۔

منہ اندھیرے اٹھ کر آبشار کی کیفیت دیکھو تو عجیب وغریب ہوتی ہے۔ کانوں میں پانی کے گرنے کی دھائیں دھائیں آوازیں تو آتی ہیں مگر آبشار نظر سے غائب رہتی ہے۔ غور سے دیکھو تو دھوئیں کا ایک زبردست بادل نیچے سے اوپر تک چھایا ہوا ہوتا ہے بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سفید دیو کھڑا ہوا ہے جس کے پاؤں وادی میں اور سر آسمان پر ہے۔ احباب کی گرمی سے جب نمی میں کمی ہونی شروع ہوتی ہے اور کہر چھٹ جاتی ہے تو آہستہ آہستہ یہ آبشار صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر دوپہر کے بعد سے تو دوسرا منظر شروع ہوجاتا ہے۔ سورج کی شعاعیں آبشاروں پر پڑتی ہیں اور اس وادی میں ایک زبردست خوش رنگ قوس قزح (اندردھنش) نمودار ہوجاتی ہے۔

اس وادی کے اندر جانے کے لئے پہاڑ کو کاٹ کر ایک نہایت دلکش رستہ بنایا ہے جو سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دامن کوہ تک چلا گیا ہے۔ یہ رستہ

تقریباً تین میل لانبا ہے۔ ہماری خیال میں معمولی چال سے تقریباً ایک گھنٹے میں نیچے پہنچ سکتے ہیں۔ سب سے آخر میں ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم بنا ہوا ہے۔ یہ ڈینجر سگنل (DANGER SINGNAL) ہے اگر اس سے نیچے گئے تو گویا موت کے منہ میں گئے۔

چوتھے دن بادل ناخواستہ ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد پھر ہم نے پلٹ کر آبشار پر ایک نظر ڈالی تو دیکھا کہ دریا کی غیرفانی موجیں پہاڑ کی چوٹی پر سے مچل مچل کر گر رہی ہیں اور ہماری بے ثباتی اور بے بنیادی پر قہقہے لگا لگا کر اونچے سروں میں یہ راگ گا رہی ہیں :۔

MAN MAY COME AND
MAN MAY GO
BUT I GO FOR EVER.

مطبوعات ممتاز مزاحیہ نگار مرزا عصمت اللہ بیگ

زیر اہتمام : عصمت میموریل پبلیکیشنز کمیٹی حیدرآباد

۱۔	انوارِ تبسم ۔ مزاحیہ کلام	سنہ ۱۹۵۵ء
۲۔	انوارِ ظرافت (حکایاتِ سعدی و جامی)	سنہ ۱۹۵۸ء
۳۔	جوہر (سوانح حیات)	سنہ ۱۹۶۰ء
۴۔	پنجسالہ منصوبہ	سنہ ۱۹۵۱ء
۵۔	متاعِ ظرافت (مزاحیہ مضامین)	سنہ ۱۹۷۸ء
۶۔	القصہ مختصر (")	سنہ ۱۹۸۸ء

مرزا عصمت اللہ بیگ کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف

مطبوعہ تصانیف

۱۔	کاک ٹیل	سنہ ۱۹۳۵ء
۲۔	زرین حکایات	سنہ ۱۹۳۰ء
۳۔	ہمارا ہندوستان	سنہ ۱۹۳۸ء
۴۔	فاقہ کیوں ؟	سنہ ۱۹۳۰ء
۵۔	رفیقِ اردو داں	سنہ ۱۹۵۴ء
۶۔	دادا لال بجھکڑ	سنہ ۱۹۴۵ء
۷۔	گدھے کی عقلمندی	سنہ ۱۹۴۵ء
۸۔	ایسوپ کون تھا	سنہ ۱۹۴۵ء
۹۔	آسمان کے بھید	سنہ ۱۹۴۰ء
۱۰۔	اورنگ آباد کالج (یا تعمیر رپورٹ)	سنہ ۱۹۳۸ء
۱۱۔	حالی و کلدار	سنہ ۱۹۴۹ء

غیر مطبوعہ تصانیف

۱۔ فنِ طباعت
۲۔ غلط در غلط ۔ ڈرامہ
۳۔ جدید انسان کی جد و جہد
۴۔ صحت کے لئے جنگ

ظریفانہ تصنیف
القصّہ مختصر
کی اشاعت پر
ہماری بہترین اور
نیک تمنائیں پیش ہیں
کے۔ یم۔ عارف الدین
ایڈوکیٹ
معتمد اعزازی
مدینہ ٹکنیکل کالج نامپلی
مدینہ پبلک اسکول حمایت نگر
مدینہ جونیر کالج فار گرلز حمایت نگر، حیدرآباد

القصہ مختصر

مرزا عصمت اللہ بیگ کی مزاحیہ تصنیف کی اشاعت پر

ہم اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں

||

ایس - پی - سمپتھی

پرنسپل

سیوا سیوانی پبلک اسکول

دیور یمجال : حیدرآباد 500014

نوٹ : مرزا امان اللہ بیگ متعلم ساتویں کلاس - سیوا سیوانی پبلک اسکول نے اس کتاب کا سرورق تزئین کر کے اپنی خوبصورت تخلیقی صلاحیتوں سے عصمت اللہ بیگ کا صحیح معنوں میں پوترا ہونے کا ثبوت دیا ہے۔" ناشر

کہتا ہوں سچ..........

یہ حقیقت، ناقابل انکار ہے کہ ابتداء سے آج تک جناب نواب عابد علی خان صاحب مدیر اعلیٰ روزنامہ سیاست کی اگر سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو مرزا عصمت اللہ بیگ کی کوئی تصنیف بھی زیور طباعت سے آراستہ ہونا تو کجا قارئین کی نظروں سے اوجھل اور مسودوں کی شکل میں بند پڑی رہتی۔

عصمت میموریل پبلیکیشنز کمیٹی نے آج تک جو تصانیف منظر عام پر لانے کا اہتمام کیا ہے اس کا سہرا، دراصل ادارہ روزنامہ سیاست کے سر جاتا ہے بطور شہادت

وہ اداریہ جو یکم نومبر ۱۹۵۵ء کے روزنامہ سیاست میں شائع ہوا ہے ... ذیل میں شائع کر رہے ہیں جو قابلِ قدر، و اظہارِ تشکر و ستائش ہے۔

مصطفیٰ کے شیردانی

نائب صدر نشین

عصمت میموریل پبلیکیشنز کمیٹی حیدرآباد

میرزا عصمت اللہ بیگ

مزاحیہ نگار و شاعر

Nawab Tahir Ali Khan
President Ismat Memorial Publications

Janab Mustafa K. Sherwani
Vice President
Ismat Memorial Publication, Hyd.